اُردو ادب جنگِ عظیم کے بعد

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم۔اے، ڈی، لٹ
لیکچرار پنجاب یونیورسٹی

اردو اکیڈمی پنجاب۔ لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :
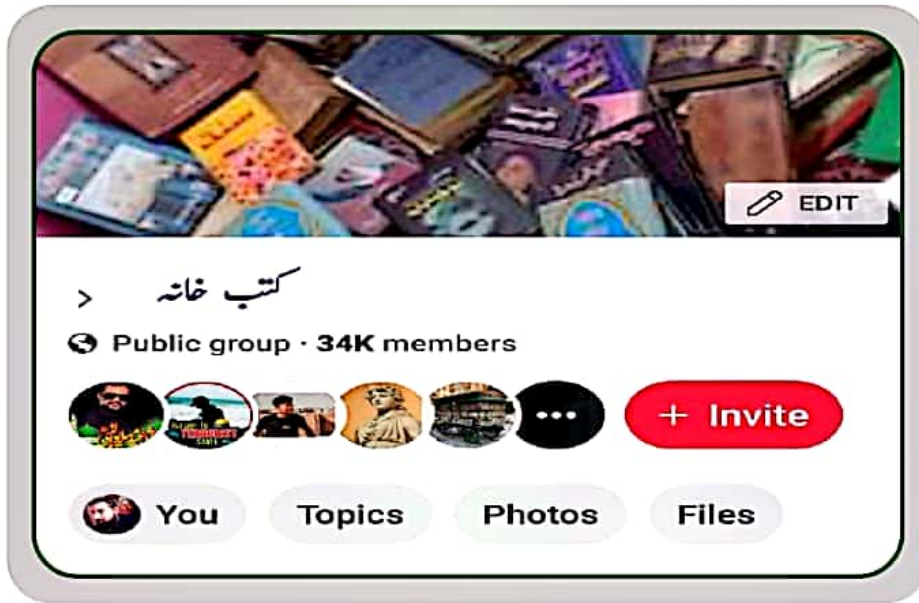
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

Scanned by CamScanner

اُردو ادب جنگِ عظیم کے بعد

دین محمدی پریس لاہور میں باہتمام ملک محمد عارف پرنٹر چھپوا کر محمد حنیف پبلشر نے
اردو اکیڈمی لاہور سے شائع کیا۔

پہلا ایڈیشن

تعداد ایک ہزار　　　قیمت

نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

مندرجات

مقدّمہ

اپنے زمانہ کے ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا جہاں بظاہر آسان ہے وہاں بہت مشکل بھی ہے۔ اور غالباً مشکل بھی اسی لئے ہے کہ بظاہر بہت آسان ہے۔ انسان کی فطرت میں اسلاف کی عظمت اور بڑائی کی جو طلسم بھری عقیدت موجود ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم عصر مصنّف کی شخصیّت نظروں میں نہیں جچتی۔ اس کے علاوہ معاصرانہ مدارات اور مراعات۔ دوستانہ مراسم اور تعلقات۔ صلہ کی تمنّا اور شہرت اور زراں کی ترغیبات حقیقتاً بے لاگ اور سچی تنقید کے راستے میں سنگِ گراں ثابت ہوتی ہیں۔ اور ایک نقّاد کے لئے کھرے

کھوٹے کا پرکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جدید ادب کے مبصّر کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے اکثر ایسے گلفروشوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن کے ہاں کا ہر پھول عمدہ، اعلیٰ اور بے نظیر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسی دعویٰ اور اسی اعلان پر ان کی بکری موقوف ہے۔

اسی طرح ادبی ادوار کی حد بندی بھی بہت مشکل چیز ہے۔ اثرات کا عمل اور ردِ عمل وہ مخفی اور خاموش سلسلۂ فعل ہے۔ جو غیر محسوس طور پر لٹریچر میں شروع ہو جاتا ہے اور اپنے وانشگاف اظہار کے لئے کسی اہم وقت اور موقعہ کا متلاشی رہتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء ایک بہت بڑی حدِّ فاصل ہے[1] جس سے ادھر اور اُدھر مختلف اثرات و عوامل، مختلف خصوصیات و امتیازات اور مختلف میلانات و رجحانات کی صاف صاف اور واضح سرحدیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً جنگ سے پہلے کے یورپ اور بعد کے یورپ میں خیالات کے معاملہ میں اتنا بیّن فرق نظر آتا ہے جس کا اندازہ شاید ہندوستان میں نہ کیا جاتا ہو۔ جنگ سے پہلے یورپ کی فضا مادہ پرستی اور قوم پرستی، سائنس

---

[1] جنگ کے اثرات کے لئے دیکھو

(1) WILLIAMS, MODERN ENG. WRITERS (1890-914)-P.3

(2) MUIR, POLITICAL CONSEQUENCES OF THE WAR (1930)

نیز پیامِ شباب (قاضی نذر الاسلام کی نظموں کا مجموعہ) ص ۷

کے ایں جہانی، پس منظر اور روحانیت سے بیزار جارحانہ سپرٹ سے اس طرح لبریز ہوگئی تھی۔ کہ غیب کی تاریکیوں سے گزر کر حقائق کی درخشاں دنیا پہ پڑنے والی نظروں نے پیش گوئی کر دی تھی۔ کہ تہذیب مغرب کی قبا کے پرزے اب فضائے آسمانی میں اڑنے والے ہیں۔ کیونکہ ڈارون کے نظریہ حیات نے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لئے جو زہریلا۔ مگر سچا تصور عجلت پسند اور فریب خوردہ انسان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس نے خود ہی ڈارونیت کی موت کا نیلا لسبت کر دیا تھا۔ وکٹورین عہد کے اواخر میں انگلستان میں جو تردد اور روحانی بے اطمینانی موجود تھی۔ اس کا اظہار اس عہد کے صاحبان کمال اور ارباب فن کے کارناموں سے بخوبی ہوتا ہے مثلاً جان رسکن نے آرٹ اور اخلاق میں جو گہرا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ اور آسکر وائلڈ نے ایک ایسا نظریہ فن پیش کیا۔ جس میں آرٹ کو زندگی سے الگ اور سراسر منقطع حقیقت ثابت کیا[1] یہ شاعر اور مصنف "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" کے خیال کا مبلغ تھا۔ اور زندگی میں مروجہ اخلاقی اصولوں کا سب سے بڑا مخالف۔ اس کی اپنی زندگی آزادروش کی آئینہ دار تھی۔ جس کا اثر انگلستان اور ہندوستان کے نوجوانوں پر بہت گہرا پڑا۔ اگرچہ ٹیلر کی کتاب

---

(1) Routh — Towards the 20th century P.9

Williams — Modern English writers (1890-1914)

The way of all flesh. نے اس کے خلاف دوسری شاہراہ نکالی لیکن واقعہ یہ ہے کہ آسکر وائلڈ، اور اس کے بعد ڈی۔ایچ لارنس نے جو راستہ قائم کیا اس کا اثر آج تک محسوس ہوتا ہے۔

یورپ میں جنگِ عظیم کا اثر مختلف طبیعتوں پر مختلف ہوا۔ایک فرانسیسی کے یہ الفاظ ایک گروہ کی ذہنیت کو آشکارا کرنے کے لئے کافی ہیں۔"کہ اگر واقعی عقل ہوتا تو شاید یہ تمام مصیبتیں ظہور میں نہ آتیں(۱)"۔ مگر ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے اس خوفناک قیامت کو روحانی کمزوریوں کی طرف منسوب کیا اور دنیا میں ایک اخلاقی انقلاب کی ضرورت محسوس کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر جماعت کا نظریہ چنداں ہمہ گیر ثابت نہیں ہوا۔اس لئے کہ تھوڑی مدت بعد یورپ میں پھر مایوسانہ شک و تردد، اجتماعی مسرت کے مقابلہ میں ذاتی خوشی کی تلاش عام آزادی رائے کے مقابلہ میں عقائد پرستانہ عصبیت اور روحانیت سے عاری تصوف کو بہت فروغ ہوا۔ جرمنی میں Expressionist تحریک عام ہوئی جس نے بعض غیر فطری رجحانات کو نشوونما دی۔ عورتوں کے بارے میں گوئٹے کا نظریہ محبت غلط ثابت کیا اور ان کے مقابلہ میں مردوں کو موضوعِ محبت بنانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ٹامس من اس جماعت کے بہت

---

(1) Rose and others – Contemporary movements in European literature.

بڑے علمبردار ہیں۔ روس میں گورکی نے عوام کے ادب کی طرف توجہ کی اور یوتن نے ادب کو زندگی سے پیوستہ کیا۔ کارل مارکس کے نظریہ اقتصاد کو اگرچہ روس کے علاوہ کہیں بھی عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم ۱۹۱۸ء کے بعد سے دنیا میں اس کے متعلق خاص دلچسپی نظر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں جنگ عظیم نے کوئی خاص روحانی اثر پیدا نہیں کیا۔ خلافت کی تحریک میں عارضی طور پر احیائے مذہب کی تحریک کو کچھ سنبھالا نصیب ہوا۔ لیکن اس کے بعد روحانی تصفیہ کی تحریک مردہ ہو گئی۔ البتہ سیاسی رنگ میں ہندوستان میں جنگ عظیم کا اثر روس کی طرح ایک نئی زندگی اور تازہ بیداری کا پیغام بن کر آیا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد جب کہ یورپ میں جنگ کا عملی طور پر خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں اثرات جنگ کے طور پر اقتصادی بے چینی پیدا ہونے کے علاوہ قومی حکومت کے حصول کے لئے تحریک ترک موالات وجود میں آئی۔ جو ٹرکی کی تقسیم اور مسئلہ خلافت کی وجہ سے مسلمانان ہند کے اضطراب و احتجاج کی بنا پر ۱۹۱۹ء میں اس درجہ قوی اور مستحکم ہو گئی کہ اس کی وجہ سے آل انڈیا نیشنل کانگریس ایک حقیقت ثابتہ بن گئی۔ ادھر ہجرت کی تحریک کی وجہ سے بعض ہندوستانی نوجوانوں کو جدید روس کے خیالات سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا۔ جنہوں نے ہندوستان میں واپس آکر روس کے اشتراکی خیالات کی تبلیغ کی۔ ملک کے اندر کسانوں اور مزدوروں

میں ایک خاص احساس ترقی پذیر ہوا جس کی وسعت اور شدت یہاں تک پہنچی۔ کہ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے اشتراکی اصولوں کی تبلیغ کی آواز اٹھی۔

تحریک ترک موالات نے خالص ادب پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا لیکن اس ذہنیت کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا جس کی پیداوار ادب ہے۔ ترکِ موالات کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد جو ہندو و مسلمانوں کو کچھ دیر باہم ملائے رکھنے کا باعث ہوئی۔ ہندوستانیوں کے لئے قومی حکومت کا حصول تھا۔ لیکن جس جماعت سے قومی حقوق کا مطالبہ تھا۔ وہ ایک مغربی قوم تھی۔ اس لئے ہندوستان میں ترکِ موالات کی تحریک سے مغرب کے خلاف بہت بڑی العداوت پیدا ہوئی۔ چنانچہ مغربی تہذیب۔ مغربی وضع۔ مغربی تراش خراش۔ مغربی علوم۔ مغربی نظریات و تصورات سب کی مخالفت ہوئی۔ مغرب سے دشمنی یا بالفاظِ دیگر مشرقیت کے احیاء کی تحریک کو زیادہ تقویت اس لئے بھی ہوئی۔ کہ ترکِ موالات کے لیڈروں میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور دوسری طرف علمائے اسلام (مثلاً مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل) نے سیاسیات کی گاڑی کو مذہبی احساسات کی قوت سے چلایا

تحریک ترک موالات کو ایک سیلاب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کا چڑھاؤ جتنا تیز اور مہیب تھا۔ اس کا اتار اس سے کہیں زیادہ فوری اور افسوسناک

ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ملک میں مصنفین کی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا ہو گئی تھی جن کے نتائج ذہن سے اردو کا ذخیرہ مالا مال ہے۔ لیکن موجودہ تحریک نے علم و ادب کی نئی دنیا میں بڑے ناموں کا کسی طرح اضافہ نہیں کیا۔ جن کو ہم زبان اردو کے عناصر خمسہ کے مقابلہ پر پیش کر سکیں۔ اقبال اور ابوالکلام، ظفر علی اور حسرت چند ایسی شخصیتیں ہیں۔ جن کی ذہنی تربیت "اتحاد اسلام دور" میں ہو چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ اس زمانے میں لکھا۔ اسے محض اثرات جنگ کی تحریک یا پیداوار نہیں کہا جا سکتا۔

بایں ہمہ تحریک ترک موالات بالکل بیکار نہیں گئی۔ انگریزی سکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کے طفیل سن ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ کے نام سے ایک یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جس کا نظام تعلیم دیسی اور قومی ضروریات کے عین مطابق تھا۔ اور جس کی غایت طلبہ میں قومی حس کی نشوونما اور آزاد ذہن کی پرورش اور تربیت تھی۔ درحقیقت جامعہ ملیہ کی کارکردگی اس کے حسن نیت اور صدق ارادت کا ایک خبر بن ترین نتیجہ ہے۔ جامعہ ملیہ میں اسلامی ہندی تمدن کی تبلیغ اور اسلامی ہندی قومیت کے فروغ کیلئے نہایت پرخلوص خدمت ہو رہی ہے۔

ترک موالات کے زمانے میں مغرب اور مغربیت کے خلاف جو زبردست نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے مشرقیت کی تحریک کو کسی قدر فروغ ہوا۔ لیکن

مغربی اثرات کے نفوذ اور شیوع کو بہت جلد ایک دوسرا راستہ مل گیا۔ اگرچہ مذہب اور فلسفۂ مذہبی میں اقبال جیسی بلند پایہ شخصیت نے مغربیت کے خلاف پرزور جہاد کا علم بلند کئے رکھا۔ لیکن ادب، شعر، افسانہ، ناول اور آرٹ (فن) کی دنیا میں مغرب کا اثر پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوا۔ علی الخصوص ۱۹۲۷ء کے بعد جب کہ ہندوستان میں کارل مارکس کے نظریات کے متعلق عام دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی روسی واقعیت (Realism) نے نوجوانانِ وطن کو مسحور کرنا شروع کیا۔ اس دور میں روسی اثرات اس درجہ کارفرما ہیں کہ اگر ہم آئندہ زمانے کو روسی اثرات کا دور کہہ دیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستانی مصنفین یورپ کے جدید ترین اثرات سے ہی متاثر ہیں اور ان اکابر کے علمی اور ذہنی فیضان سے یکسر محروم ہیں۔ جو آج سے تیس چالیس سال پہلے یورپ کے دل و دماغ پہ چھائے ہوئے تھے۔ بلکہ یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مصنفین پہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۵ء تک کے دور میں بعض ایسے مفکرین کا اثر نظر آتا ہے جن کا مسلک یورپ میں ناقابل قبول قرار پایا اور مسترد ہو چکا تھا۔ گویا ہندوستان میں دنیا کی عام ادبی اور علمی لہر پندرہ بیس سال بعد پہنچتی ہے۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے نمایاں طور پہ آرٹ محض آرٹ کی خاطر کا مذہب فروغ پذیر ہوا۔ چیخوف جو روس میں انقلاب کے بعد بہت کچھ نامقبول ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں بہت پسند ہونے لگا۔ اسی

طرح آسکر وائلڈ کا تصورِ زندگی نوجوانوں کے لئے اس وقت بہت کچھ کشش کا باعث بن رہا ہے جب خود انگلستان میں اس کے خلاف باقاعدہ ردِعمل ظہور میں آگیا۔

اس دور میں ادب اور زندگی کی تحریک پوری قوت کے ساتھ پھیلی جس میں مفکرین مغرب کے تتبع میں اس بات پر خاص زور دیا کہ ادب کا زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہونا چاہئیے۔ وہ ادب جو ہمیں روزمرہ زندگی کے مسائل سے دور لے جاتا ہے۔ بیکار اور بیمار ادب ہے جس سے قوم کو کچھ فائدہ نہیں۔ اس تحریک کے علمبرداروں کے نزدیک روایات اور قدامت کا احترام ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اور نئی زندگی کے ساتھ ساتھ نئی روایات اور نئے رسوم اور طریقے ظہور میں آنے چاہئیں۔

اس دور کے لٹریچر میں صوبہ پرستی کے آثار نہایت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ غلامانہ زندگی کے زیرِ اثر ہندوستان جیسے وسیع برِاعظم میں وحدت کا پیدا ہونا ایک مشکل بات ہے۔ لہٰذا اس میں مختلف قوموں اور جماعتوں خطوں اور صوبوں کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا نہایت آسان ہے ۱۹۲۳ء کے بعد ہندوستان میں منافرت اور باہمی تنازعات کی صرصر کچھ ایسی چلنے لگی کہ ملک کی وحدت ایک بسرا ہوا خیال بن کر رہ گئی۔ اس زمانے میں ہر صوبے میں بعض ایسی سوانح عمریاں لکھی گئیں جن سے ان خاص خطوں کے بعض تاریخی

ناموروں کے کارناموں کو اجاگر کرنا مقصود تھا۔ اسی طرح زبان اردو کے اصلی مولد اور وطن پیدائش ہونے کا دعویٰ مختلف صوبوں کی طرف سے کیا گیا جو ایک آدھ جگہ تو خالص علمی تحقیق کا ثمرہ ہے لیکن بیشتر اسی صوبہ پرستی کا مظاہرہ!

تحریک ترکِ موالات میں زبان اردو کو عوام میں پھیلنے کا بہت موقعہ ملا۔ خلافت اور کانگریس کے مبلغین نے گاؤں گاؤں میں پھر کر اپنے مقاصد کی تبلیغ کی جس کے لئے زبان اردو کو ذریعہ اظہار خیال قرار دیا۔ اس عہد میں تحریر کے مقابلہ میں تقریر کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ اگرچہ یہ دور بہت سے اچھے اخبار نویسوں کو منصۂ شہود پر لانے کا باعث ہوا۔ لیکن چونکہ یہ عہد جذبات کا دور تھا۔ اس لئے مفکّرین کی بجائے مقرّرین کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے اثرات محض نقش بر آب ہونے کی وجہ سے بہت جلد دلوں سے محو ہو گئے۔ اور خیالات و افکار کی دنیا میں ان کا کوئی پائدار اثر باقی نہ رہا۔ اردو کے اس قبولِ عام کے خلاف ہندوؤں میں بہت زبردست ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ ہندی کے فروغ کے لئے پہلے سے بھی باقاعدہ، پرجوش اور منظم کوششیں ظہور میں آئیں۔ اسی دور میں ہماری زبان کے لئے اردو کی بجائے ہندوستانی کے پرانے لقب کا احیاء ہوا۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ ایک آسان مشترکہ "ہندی اردو" زبان وجود میں لائی جائے جو تمام ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے۔

بعض بلند پایہ رسائل اور ادارے بھی اسی دور کی یادگار ہیں مثلاً معارف (اعظم گڑھ) جامعہ (دہلی) اردو (اورنگ آباد) ہندوستانی (الہ آباد) ہمایوں (لاہور) کاروان (لاہور) اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ کے ترجمے اور جامعہ عثمانیہ کا سیاسی لٹریچر بھی قابل ذکر ہے۔

۱۹۳۶ء میں نیا ادب یا ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ "ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائی جائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائی جائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے"۔ نیز یہ کہ "ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں[1]"۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ابھی نئی ہے اور ہر نئی تحریک کی طرح جوش اور انتہا پسندانہ بے اعتدالی کے اثرات اس میں نمایاں معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ جب بہتر لوگ اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لیں گے۔ تو اس سے ملک کے ادب کو بہت فائدہ ہوگا

اب تک جو کچھ بیان ہوا اس سے مقصد ادبی تحریک کے متعلق متفرق اظہار رائے تھا۔ مجموعی اعتبار سے یہ دور ۱۸۵۷ء سے تحریک خلافت کے زمانے

---

[1] اقتباس از اعلان نامہ انجمن ترقی پسند مصنفین (از رسالہ اردو صفحہ ۳۲۳ (۱۹۳۶)

کے جو لذتِ یقین کا حامل تھا) روحانی بے اطمینانی، مذہبی کش مکش اور افکار کے ہیجان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ "اتحادِ اسلام" والے کے مفکر روحانی سکون کے پیدا کرنے اور ایمان و ایقان کے مضبوط کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہے۔ مثلاً علامہ اقبال وغیرہ) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غلامانہ زندگی سیاسی ہیجان اور یورپ سے مسلسل و پیہم رابطہ و تعلق کی وجہ سے بیدار اور تعلیم یافتہ جماعت میں تردّد اور شک، لاادریت اور مادیت کے عناصر زیادہ سے زیادہ ہوتے رہے ہیں اور روحانیت ایک موہوم بہشت کی طرح اب اس قابل نہیں سمجھی جاتی۔ کہ مادہ پرست مخلوق اس کو قابلِ اعتنا خیال کرے۔ مجلسی مسائل کی بدستور چھان بین ہو رہی ہے اور اگرچہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی تحریک اور جداگانہ علیحدہ قومیت کے تصوّر نے مسلمانوں کی سیاسی عصبیت کو محکم بنا دیا ہے لیکن مذہب کے روحانی پہلو اور اس کے مجلسی نظام کے متعلق ان تحریکوں سے "تنقید اور جرح و قدح میں کمی نہیں ہوئی۔ درحقیقت علامہ اقبال کے روحانی اور ایمانی پیغام کی بے اثری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ان کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے ان کے مذہبی فکر سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ادب کے لطیف مظاہر کے بارے میں کوئی نا دیہ نظر متعین نہیں ہوا۔ کیونکہ آرٹ اور زندگی کا فلسفہ نہایت سختی سے آرٹ محض آرٹ کی خاطر کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ جیمز جائس کی حقیقت پسندی اور ڈی۔ ایچ لارنس کی عریاں نگاری نوجوان ادیبوں میں

بہت فروغ پا رہی ہے۔ جنس اور اقتصاد کو بہت اہمیت مل رہی ہے۔ اور اگرچہ کسان اور مزدور اور ملکی غلامی کا مسئلہ نیا ادب، کے مقاصد میں بمنزلۂ عنوان ہے۔ لیکن محنت کش اور مزدور ابھی تک اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ عورت کو چھوڑ کر ہمارے نوجوان ادیب ان غریب اور بے کس انسانوں کی اصلاح اور بہتری کی طرف ملتفت ہو سکیں۔ پھر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اسلاف کی تقلید کے خلاف احتجاج کرنے والے یورپ کی تقلید میں جمود کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔

پہلا باب

مذہب علم الکلام اور سیاست

مذہب اور متعلقات مذہب کو اس دور میں ایک زندہ حقیقت کا درجہ حاصل ہے اور ابھی تک دنیائے اردو کے مفکرین کے لئے مخالفانہ یا ہمدردانہ توجہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ چونکہ اس دور میں مسلمانان ہند کی (۱۸۵۷ء کے بعد) سب سے بڑی اجتماعی مذہبی تحریک خلافت ظہور میں آئی۔ اس لئے اس سے قطع نظر ممکن نہیں۔

'اتحاد اسلام' دور کے سب سے بڑے رہنما اور مفکر جنہوں نے سرسید کے علم الکلام اور فلسفہ سیاست کی مؤثر مخالفت کی وہ علامہ شبلی تھے۔ اگرچہ مدرسہ دیوبند اپنے رنگ میں قال اللہ و قال الرسول کی مشعل کو روشن

کئے ہوئے تھا لیکن شبلی نے اپنے مذہبی فکر کو جارحانہ سیاسی نصب العین سے مسلح کیا اور نوجوانوں کے مشوش اور تاریک قلوب کو مغرب کی مخالفت کی تیز روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی۔ شبلی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور کارنامہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو سر سید کے علم الکلام اور ان کی سیاست کے اثرات سے بچایا جائے چنانچہ انہوں نے دوسرے کاموں کے علاوہ خود علی گڑھ کالج (جو اب یونیورسٹی ہے) کے مقابلہ میں ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو "توسیع علم اور ترقی و اصلاح ہی کا مرکز نہ رہا بلکہ علی گڑھ کی مخالفت میں ردِ عمل کا مرکز بھی بن گیا"۔[۱]

اس موقعہ پر ہمیں مولانا شبلی کے فکر کے امتیازات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ مقصد کے لئے صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ کہ شبلی کی شخصیت کا اثر "اتحاد اسلام دور" کے اکثر مصنفین مذہب پر بہت گہرا نظر آتا ہے۔ ان اثرات کا رنگ ان کے رفقاء اور شاگردوں کے ذریعے ترکِ موالات کے زمانے میں اور بھی گہرا ہو گیا۔ مغربی تعلیم اور مغربی طرز زندگی کے خلاف جو جہاد مولانا شبلی نے شروع کیا تھا۔ اس کی تکمیل مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان نے اس نئے دور میں بڑی شدومد کے ساتھ کی۔ اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کو دوبارہ جب زندہ کیا تو اس کو زندگی بہت کم ملی۔ تاہم

---

[۱] موج کوثر۔ شیخ محمد اکرم ص ۱۱۸

الہلال کے قدیم دور نے جو ذہنیت مغرب کے خلاف پیدا کر دی تھی وہ بجائے خود جدید خیالات کی تشکیل کے لئے کافی تھی۔

مولانا شبلی کے رفقائے کار اور تلامذہ نے اسلام کے ذہنی اور عملی پہلو کا جس رنگ میں مطالعہ کیا اور ان کو جس دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا اس کی سب سے بڑی غایت یہ تھی کہ اسلام کو جدید سائنس اور علم کی دنیا میں کامیاب ترین مذہب ثابت کیا جائے۔ مغرب سے متاثر ہو کر ہمارے نوجوان اسلام کے مستقبل بلکہ اس دور عقل و ترقی میں اس کی زندگی سے بھی مایوس ہو رہے تھے۔ ان کے دلوں میں پھر سے یقین پیدا کیا اور درخشاں ماضی کی دل کش تصویریں دکھا دکھا کر یہ حقیقت نمایاں کی کہ اسلام کا حال اگرچہ مایوس کن ہے لیکن ماضی کے اصولوں پر عمل کرنے سے مستقبل بہتر بن سکتا ہے۔

اس کام کے لئے شبلی اور رفقائے شبلی نے تاریخ اسلام[1] سے کام لیا اور تمدن اور علوم سیاسیہ کی روشنی میں اپنی سوسائٹی کا تجزیہ کیا۔ خالص مذہبی عقائد پر بحث و نظر سے اجتناب اس لئے ضروری نظر آیا کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ تھی۔ علوم جدیدہ کی روشنی میں اپنے علوم کو دیکھا اور ان سے اسلام کی فوقیت ثابت کی۔ فکری ہیجان کے اس پہلو سے زیادہ واقفیت حاصل

---

[1] دار المصنفین کی کتب تاریخ اور معارف اعظم گڈھ کی مجلدات از ۱۹۱۶ء تا حال، ملاحظہ ہوں۔

کرنے کے لئے معارف اعظم گڑھ کی مجلدات کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ یہ رسالہ شبلی کے ارشد تلامذہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے ۱۹۱۶ء میں جاری کیا تھا۔ اور درحقیقت اسی رسالہ کو افکار شبلی کا ترجمان سمجھنا چاہیئے

مولانا سید سلیمان نے سینکڑوں مضامین کے ذریعے اسلام کے تمدنی اور عقلی پہلوؤں کی فوقیت پر بحث کی ہے۔ وہ اپنے استاد شبلی کی طرح مغرب کے سارے نظام علمی و تمدنی کے مخالف ہیں۔ اور بقول شیخ محمد اکرام "وہ اس مخالفت کے اظہار کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے"[۱]۔ تحریکِ خلافت کے دوران میں مسئلہ خلافت کی مذہبی اہمیت پر بہت عالمانہ تحقیق و تدقیق ہوئی۔ اس لئے کہ مسلمانان ہند اپنی موجودہ سیاسی زندگی میں اس حادثے سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ اس علمی اور قلمی کوشش میں مولانا سید سلیمان۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ ابوالحسنات ندوی اور بعض دوسرے حضرات نے بھی شرکت کی۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد (جو دارالمصنفین کے حلقہ سے الگ ہیں) نے اپنے خطبہ صدارت میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی۔ اس تجزیہ و تحلیل کا ایک غیر محسوس سا اثر مسلمانوں کے ذہن پر یہ پڑا کہ انہوں نے پہلی دفعہ خلافت کے اصول اور موجودہ جمہوریت کے تقابل کے مبحث پر نگاہ ڈالی۔ مگر جب خود ترکی نے خلافت کو منسوخ کر دیا۔ تو مسلمانانِ ہند

---

[۱] موجِ کوثر

اس تلخ مگر سچی حقیقت سے روشناس ہو گئے کہ اب انہیں ہندوستان کے وطنی مسائل میں دلچسپی لینی چاہیئے۔

مذہب اور عقلیات میں مولانا عبدالماجد اور مولانا عبدالباری کے مضامین خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ برکلے کا تصوّر الہ مسلمانوں کے نکتہ کے بہت نزدیک ہے۔ اس کے مکالمات کا ترجمہ ہُوا۔ مولانا عبدالباری[1] مذہب اور عقل کی حدود پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ریل کی دو گاڑیاں ٹکرا سکتی ہیں۔ اور ٹکراتی ہیں۔ لیکن ریل گاڑی اور جہاز میں تصادم ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ریل سمندر میں چل ہی نہیں سکتی۔ اور نہ جہاز خشکی پر"۔ مولانا شبلی نے شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے فلسفہ سیاست کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ اس کے زیر اثر حجۃ اللہ البالغہ کی جانب خاص توجہ ہونے لگی۔ چنانچہ اب شاہ صاحب کے متعلق رسائل کے خاص نمبر نکل رہے ہیں۔

اس دور میں قرآن مجید کے مطالعہ کی طرف بہت میلان پیدا ہُوا چنانچہ ارض القرآن کے نام سے سید سلیمان صاحب نے ایک کتاب لکھی جس میں قرآن مجید کے جغرافیہ سے بحث کی ہے[2]۔ معلومات جدیدہ کی روشنی میں اگرچہ اس کتاب کے بعض واقعات غلط ثابت ہوئے لیکن قرآن حکیم کے

---

[1] رسالہ معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۲۰ء [2] قرآن مجید پر چند کتابیں جو اردو میں اس عہد میں لکھی گئی ہیں یہ ہیں۔ مولانا عبدالحی فاروقی کی کتابیں کشاف الہدی از سیٹھ یعقوب حسن۔ مقاصد القرآن از مولانا ممتاز علی۔ ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد۔ بیان للناس از مولانا احمد [illegible]

مطالعہ کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔

مولانا ابوالکلام اگرچہ دار المصنفین سے متعلق نہیں لیکن وہ مولانا شبلی کے سرچشمۂ افکار سے بہت سیراب ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ شبلی کی طرح سر سیّد کے اثرات کی مخالفت ہے۔" سر سیّد سے ان کے اختلافات صرف مذہب اور سیاسیات تک ہی حاوی نہ تھے۔ بلکہ علی گڑھ تحریک کے قریب قریب ہر پہلو پر حاوی تھے"۔ ۵ے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت، آپ کا تبحر، آپ کی مقناطیسی کشش، آپ کی تحریر و تقریر، آپ کا ذوق علم، آپ کا اعلیٰ ذوق غرض آپ کی جامع قابلیت نے بہت جلد آپ کے اثر کو نمایاں کر دیا۔ شبلی ایک مصنف تھے ان کا وقت بیشتر تدوین و تالیف میں گزرا لیکن مولانا ابوالکلام نے جریدہ نویسی اور صحافت کے ہمہ گیر اور موثر فن سے اعتصام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علیگڑھ پر جو حملہ انہوں نے کیا وہ شبلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہلاکت آفرین تھا۔ اگرچہ علمائے اسلام پر مولانا ابوالکلام کا اثر زیادہ نمایاں معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ علماء کے نزدیک زہد و تقویٰ کا جو معیار ہے۔ اس پر مولانا ابوالکلام پورے نہیں اترتے۔ تاہم مولانا کی علمیت اور فاضلانہ شان سے بڑے بڑے علماء بھی مرعوب ہیں۔ چنانچہ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے

۵ے موج کوثر ص ۱۵۴

ایک موقعہ پر ان کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھا تھا "ان سطروں کے لکھتے ہوئے ہم کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے۔ کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی یا امیہ بن عبد العزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں؟"[1]

مولانا ابو الکلام احیائے مشرقیت کی تحریک کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ الہلال والبلاغ کے ذریعے آپ نے اپنا پیغام جدید تعلیمیافتہ لوگوں تک پہنچایا اور اس میں بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ آپ کا سٹائل آپ کی عظیم الشان شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ علامہ اقبال اور مرزا غالب کی طرح آپ بھی اپنے بلند اور عالی خیالات کو آسان زبان میں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ شاید خیالاتِ بلند سے زیادہ ان کا فراواں خلوص اور بے پایاں جوش۔ عام اور معمولی الفاظ کے پیمانہ میں نہیں سما سکتا یہ درست ہے کہ اس طرزِ تحریر نے اردو زبان کی سلاست کو بہت نقصان پہنچایا[2]۔ لیکن مولانا اس معاملے میں مجبور تھے۔ آپ کے قلب میں جو طوفان اُمڈ رہا تھا۔ وہ قیود اور رسوم کی پابندیوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

آپ کا علمی کارنامہ سیات کیا ہے؟ آپ نے جدید علم کلام کی تردید

---

[1] معارف مارچ ۱۹۱۹ء مضمون "ہمارے موجودہ نظر خیال الکلام"

[2] سکینہ۔ تاریخ اردو ادب۔

واصلاح کی اور مغربیت کے طلسم کو پاش پاش کرتے ہوئے خود اعتمادی کے جذبات کو بلند کیا۔ قرآن مجید کا غائر مطالعہ کیا۔ اور لوگوں میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کیا۔ آپ شبلی کے بعد پہلے مصنف ہیں۔ جنہوں نے تصانیف مذہبی کا معیار بلند کرتے ہوئے جدید علمی اصولوں سے بلا تکلف اپنے تصورات میں مدد لی۔

آپ کی سب سے بڑی تصنیف ترجمان القرآن ہے۔ جو کئی بار زندانوں کی چار دیواری میں جبری تنہائی کی فرصتوں میں لکھی گئی۔ اور خانہ تلاشیوں اور اسیری کے مواقع پر ضائع ہوتی رہی۔ بالآخر لوگوں کے اصرار سے آپ نے دوبارہ اپنی یادداشتوں کو تلمبند کیا اور ۱۹۳۰ء میں ترجمان کی پہلی جلد شائع ہو کر لوگوں کے سامنے آگئی۔

ترجمان القرآن دور حاضر کے ایک عظیم الشان مفکر اور مفسر کا کارنامہ ہے۔ اس میں قرآن حکیم کے ان معارف و حکم کی نقاب کشائی کی گئی ہے جن کی موجودہ زمانے کو نہایت ضرورت تھی۔ کچھ مدت سے مسلمانوں میں عمل سے خالی عقاید پرستی آچلی تھی۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ قوم کو نیک عملی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ جو قرآن مجید کا ایک اہم موضوع ہے۔ محض نیک عقیدہ اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ اچھے عقیدہ کا نتیجہ حسن عمل ہونا چاہیے۔ اگر یہ نہیں تو قرآن کی رو سے وہ عقیدہ کھوکھلا

ہے۔ مولانا ابوالکلام نے جس طرح نیک عملی کی تلقین و ہدایت کی ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کو عالمگیر انسانیت کا پیغام بردار ثابت کیا ہے۔" غور کرو۔ مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لئے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا، کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی، خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔ دوسری یہ کہ وہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوتِ قرآنی کی اصل روح یہی ہے"[1]

مولانا نے وحدت دین اور عالمگیر انسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے اس پر بعض معترضین[2] نے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ لیکن در اصل اس وقت انسانی وحدت کی جو تحریک دنیا میں چل رہی ہے۔ اس کا پہلا علمبردار قرآن حکیم ہے۔ لہذا اس کی توضیح نہ کرنا بہت بڑی فروگذاشت ہوتی۔ ہندوستان میں نئی قومیت سے اتحاد و تعاون کی خواہش بھی ترجمان کے اوراق میں منعکس ہو رہی ہے جو اس شور و غوغا کی اصل وجہ معلوم ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ترجمان کے مداحوں اور مخالفوں نے ابھی تک ٹھنڈے دل

---

[1] ترجمان القرآن ص ۴۷، [2] تنقید از غلام احمد پرویز (معارف جنوری ۱۹۳۲ء و ما بعد)

سے اس کے مطالب پر غور نہیں کیا۔ امید ہے کہ جب خاموش اور خالی از جذبات فضا میں اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو یہ تفسیر ایک عظیم الشان تصور کی طرح بہت سے نئے اثرات پیدا کرے گی۔

ترجمان القرآن کا سٹائل[1] الہلال کے مقابلہ میں سلیس ہے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب عمر کے ڈھل جانے سے جوش کے طوفان میں بھی کمی واقع ہو گئی ہے۔ یا پھر اس لئے کہ قرآن مجید کا حظیرۂ قدس اس آزاد

---

[1] شیخ محمد اکرام صاحب نے مولانا کے سٹائل پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں لیکن در حقیقت ہر شخص کا سٹائل اس کی شخصیت، اس کے ماحول اور اس کے نصب العین پر موقوف ہوتا ہے۔ سرسید کی تحریر اس لحاظ سے پر سکون تھی کہ وہ مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے اور تعمیر کے لئے ذہن کو تیار کر رہے تھے لیکن مولانا کا کام جوش پیدا کرنا تھا۔ مولانا ظفر علی کے سٹائل پر آزاد کا اثر ضرور ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے علامہ اقبال نے بھی جو نصب العین اپنے سامنے رکھا اس کی وجہ سے ان کی زبان مشکل تھی۔ مزید یہ کہ مولانا اردو میں گہری اسلامیت اور عربیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہ خیال کہ محض اس طرز تحریر سے اردو اسلامی زبان ہو کر رہ گئی صحیح نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہندو فارسی عربی کے عالم ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب انقلاب حالات نے ان میں سیاسی بیداری پیدا کر دی ہے۔ جس کی بنا پر وہ ہندی کے حامی ہیں۔ اور اگر آپ اپنی زبان کو خالص ہندی بھی بنا کر پیش کریں گے۔ تب بھی ہندو اردو کو اپنی زبان نہیں کہیں گے۔

خرامی کا متحمل نہیں ہو سکتا ؎

عرفی متاب این رہ نعت است نہ صحرا است

ہشیار کہ رہ بردم تیغ است قدم را (عرفی)

مولانا ابوالکلام کا سٹائل عظمت اور شان و شوکت کے اعتبار سے ابوالفضل سے مشابہ ہے۔ ان کے جذبات کا سیلِ رواں جب اُمڈتا ہے تو راستے کے نشیب و فراز سے بے پروا ہو کر کوہ و دمن سے گزر جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ "ان کی تحریروں میں روشنی تو ہے لیکن حرارت نہیں"۔ مولانا کا بنیادی کام احیائے مذہب تھا۔ اصلاح اخلاق یا تلقین صفائے نفس نہ تھا۔[1] انہوں نے قوم میں بیداری، جرأت اور ہمت کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے۔ لیکن متقین اور صلحا کا رنگ پیدا نہیں کیا۔ مولانا اس باعمل جرنیل سے مشابہ ہیں جس نے ساری عمر میدان جنگ میں سپاہیوں کے عزم اور جوش کو مشتعل کرنے میں بسر کی ہو اور یہی وہ مجاہدانہ عزیمت ہے۔ جو انہیں حجرہ نشین علماء سے ممتاز کرتی ہے۔ جن کی زندگی اس جنگ آزما بہادر کی دل کی دھڑکن سے نا آشنا ہے جس کا ہر لمحہ ہنگاموں میں گزرتا اور طوفانوں میں بسر ہوتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک دکھ کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔ کہ مولانا

---

[1] موج کوثر ص ۱۶۲ تا ۱۶۶۔

کی بلند شخصیت اور نادر ہستی سے علم و فضل کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ سیاسیات وطنی کی الجھنوں کی نذر ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نے وطن اور ملت کے مفاد کے لئے اپنی عمر گرانمایہ کو وقف کر دیا ہے۔ اور اپنی بے مثال یکرنگی اور بے نظیر ثابت قدمی سے خلوص اور پختگی کا سکہ بھی بٹھا دیا ہے۔ لیکن رونا تو یہ ہے کہ وہ شخص جو اس دور کا شاہ ولی اللہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یا جسے ہم ثانی ابن تیمیہ کہہ سکتے تھے۔ علمی لحاظ سے قوم کے لئے اتنا مفید ثابت نہ ہو سکا۔ باقی رہی سیاست سو اس کا رخ بھی مخالف ہواؤں کی طرف ہے اور مولانا تاریک رات میں مہیب طوفانی سمندر کی کسی کشتی کے ایسے ناخدا سے مشابہ ہیں جس نے اہل کشتی کی رائے کے خلاف صرف اپنی بصیرت کے اعتماد پر بادبانوں کو کھول رکھا ہو۔

مولانا ابوالکلام کی طرح اقبال بھی "اتحاد اسلام دور" کے ماحول میں سوچنے اور لکھنے لگے۔ آپ کے خیالات اور تصورات کا ارتقا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ عصری تحریکوں سے پورے پورے متاثر ہوتے رہے ۱۹۰۷ء سے لے کر اتحاد اسلام دور کے آغاز تک آپ نے حبِ وطن کے گیت گائے ۱۹۱۱ء سے لے کر تحریک خلافت تک آپ نے اتحاد اسلام تحریک کی ترجمانی کی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۳ء تک آپ نے تحریک خلافت کا ساتھ دیا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد آپ نے یورپ کی نیشنلزم

کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل محسوس کیا جس کے بعد آپ نے ایک عالمگیر نظام کے امکانات پر غور کیا۔ سرمایہ اور مزدور کی کشاکش میں آپ نے مزدور کی حمایت کی اور ۱۹۳۱ء میں آپ نے مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں ایک نیا گھر بسانے کا تخیل پیدا کیا اور آخری وقت تک اس خیال پر قائم رہے۔

لیکن ان ارتقائی تغیرات کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال کا فکر ہمیشہ مغربیت کے خلاف ردِّ عمل کا ایک زبردست مظہر رہا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں "شمع و شاعر" میں آپ نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز | بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی | پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ خانہ ساز | دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اس زمانے سے لے کر وفات تک اقبال نے مغرب کے خلاف جنگ کو جاری رکھا۔ شروع شروع میں یہ محض منفیانہ حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جذبہ پیکار ایک تعمیری تصوّر میں مبدّل ہو گیا۔ انہوں نے دنیا کے لئے ایک پُر امن اور مقدّس نظام کا خاکہ تجویز کیا جس میں خالص اسلامی فکر سے تصوّراتی رنگ بھرے۔ سب سے پہلے انسانِ کامل کی نشو و نما پھر ایک اعلیٰ اور مثالی سوسائٹی کی تشکیل۔ اقبال کے فکر کے دو اہم اجزا ہیں۔ یہ افلاطون کی جمہوریت سے مختلف سر ٹامس مور کی

جنت (utopia) سے زیادہ عملی اور ابراہیم جیلی کے خیالی الانسان الکامل سے بلند تر اور نٹشے کے مافوق الانسان سے زیادہ روحانی شخصیت کا تصور تھا۔

اقبال کی سب سے بڑی خوبی یا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ "مسلمان" رہنے پر مجبور تھا۔ اس کے تصور کی ساری عمارت فکر اسلامی کی اینٹ، چونے اور گارے سے تعمیر ہوئی۔ وہ آئیڈیل سوسائٹی کے لئے بھی اسلامی اصولوں سے کام لینا چاہتا ہے وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ کہ دنیا کا کوئی اعلیٰ نظام اسلامی تصور معاش و معاد کو جذب کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اقبال نے اسلام کے متعلق اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود مسلمانوں کو توحید و رسالت میں پختہ اعتقاد رکھنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد قرآن مجید کے مطالعہ پر اصرار کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک اسی کتاب فطرت میں زندگی اور موت کے سارے اسرار درج ہیں

اقبال کا فلسفہ خودی خود شناسی کا ہدایت نامہ ہے۔ اقبال کی رجائیت مردہ اقوام کے لئے پیام حیات ہے۔ اقبال کی عقلیت دشمنی عشق کا سوز یقین پیدا کرتی ہے۔ اقبال کا عقیدہ قوت غلامی کی رگوں کو کاٹنے والا ہے۔

اقبال پر یورپ کا اثر کہاں تک ہوا؟ اس کا جواب دیتے وقت لوگوں نے عجیب عجیب ستم ظریفیاں کی ہیں۔ بعض "اقبالسٹ" اس بات پر مُصر ہیں کہ اقبال نے یورپ کے افکار سے بالکل اثر قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ چیز عظمت کے منافی ہے۔ لیکن راقم الحروف کو اس خیال سے اتفاق نہیں۔ اقبال یورپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے بعض افکار کو اپنے فلسفہ میں جذب کیا۔ اور بعض سے ردِ عمل کے طور پر کوئی سلبی رائے قائم کی۔ البتہ اس حد تک درست ہے کہ اقبال یورپ کے افکار کو اسلامیات کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور مقابلہ اور تقابل کے بعد اپنا اجتہاد کرتے ہیں۔ جو سرسیّد وغیرہ کے اجتہاد سے بالکل مختلف ہے۔ "کیونکہ" ان کا اجتہاد تقلیدی اجتہاد تھا۔"[۵] آپ نے برگساں کے Intuition کی بحثوں کا مطالعہ کیا۔ اور کانٹ کے critique of pure Reason پر تنقید کی نٹشے کے افکار کی مدح کی اور براؤننگ کے پُر امید کلام سے حظ اٹھایا اور پھر گوئٹے کے تصوّف اور مشرق پسندی کی بھی تعریف کی۔ غرض یورپ کے فلسفہ کے گہرے مطالعہ کے بعد اس کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہونا بڑائی اور عظمت کے منافی نہیں۔ اس لئے کہ اس سے اقبال کی مشرقیت کے

---

[۵] موج کوثر از شیخ محمد اکرم ص ۱۸۱

احساسِ برتری کو بالکل صدمہ نہیں پہنچا۔ بلکہ درحقیقت ان مغربی فلسفیوں سے اقبال نے صرف وہی تصوّرات لئے جو ان کی مشرقیت کے لئے قابلِ قبول تھے۔

اقبال کا فکر جدید و قدیم کا ایک خوشگوار امتزاج ہے انہوں نے اسلامی عقائد کے بعض orthodox پہلوؤں کی زبردست حمایت کی ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے وقت کے ساتھ ان کے تعلقات عموماً خوشگوار رہے۔ دراصل بقول شیخ محمد اکرام وہ اس بحث میں ہی نہ پڑنا چاہتے تھے اس لئے کہ ایک مومن کو زمان و مکان کی پابندیوں سے بلند ہو جانا چاہیئے سلہ

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصّۂ قدیم و جدید

اقبال شاعر تھے لیکن اب ان کو محض شاعر سمجھنا دیانت اور حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ صرف شاعری ان کے لئے عیب ہے۔ آپ کو احیائے اسلام کی تحریک کا رہنما خیال کرنا چاہیئے اور یہی ان کی سب سے بڑی تعریف ہے۔

شبلی۔ ابوالکلام۔ اقبال اور سید سلیمان نے سر سید کی تحریک

سلہ موجِ کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۱۸۱

کے خلاف جو جہاد کیا اس کے بعد یہ خیال میں نہ آسکتا تھا کہ عقل پسندی، مادیت اور مغربی تصوّر زندگی پر قائم کی ہوئی کوئی مذہبی تحریک پھر سے ظہور میں آ سکے گی۔ لیکن ملک میں جدید قسم کی تعلیم و تربیت کا نظام اتنا پھیلتا گیا اور کالجوں کے ایوانوں سے یورپ کے تصوّرات سے لبریز ذہن اس کثرت سے نکلنے لگے۔ کہ یہ قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ جدید انگریزی تعلیم پانے والے حضرات میں کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوگا۔ جو سر سیّد کی عقلیت اور مادیّت کی تحریک کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو از سرِ نو جوڑ سکے گا۔

۱۹۱۷ء میں نواب وقار الملک کے انتقال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سیّد سلیمان نے یوں لکھا تھا[۱]۔ "یہ ہستی گرانمایہ جس نے ہماری دنیا کو ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا، ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا۔ اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہوں گے۔ بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ اور جبے ہوں گے۔ اب مشرق کی قومیّت پر حکومت نہ کرے گا بلکہ مغرب، اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لئے جوشِ دل اور اخلاصِ عمل ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ

---

[۱] معارف۔ فروری ۱۹۱۷ء

ایک کامیاب عمدہ اور عمدہ سوٹ"! یہ ایک پیشگوئی تھی۔ بلکہ ایک چیلنج
تھا جو مشرقی مستشرقیوں کی طرف سے مغربی مستشرقیوں کی طرف پھینکا گیا تھا
(اور غالباً اس توقع کے ساتھ کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا) لیکن
آخر یہ پیشگوئی پوری ہو کر رہی اور ۱۹۲۴ء میں عنایت اللہ خاں المشرقی
نے ایک کتاب "تذکرہ" کے نام سے شائع کی جس میں قرآن حکیم کو مغربی
تصورات کی عینک سے دیکھنے کی تازہ کوشش ظہور میں آئی۔ تذکرہ کا نمایاں
امتیاز جو سر سید احمد خاں کے فکر سے اس کو جدا رنگ دیتا ہے یہ ہے کہ
اس میں ایک شدید قسم کی جارحانہ اسلامی سوسائٹی کا نظریہ زندہ کیا گیا ہے
مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید دونوں بزرگ ایک پرُامن اور اعتدال
پسندانہ اسلامی زندگی کے مبلغ تھے۔ اور جہاد کے تشدد پسندانہ خیال
سے ان کو سخت مخالفت تھی۔ لیکن مشرقی صاحب اس معاملے میں ان
دونوں کی پوری پوری ضد ہیں۔

۱۹۲۳ء میں تحریک ترکِ موالات ناکام ہو کر معدوم ہو گئی۔ ملکی سیاسیات
میں فرقہ پرستانہ ذہنیت کچھ اس انداز میں پیدا ہو گئی کہ ہندو اور مسلمان
اپنی اپنی جداہستی کے بچاؤ اور حفاظت کی تدابیر میں منہمک ہو گئے اور اگرچہ
مولانا محمد علی وغیرہ ابھی تک کانگرسی سیاسیات کے زبردست مؤید تھے
لیکن قوموں کے دل ایک دوسرے سے اس طرح پھر گئے تھے۔ کہ

ان کو پھر سے پیوند دینا معجزہ سے کم نہ تھا۔

ان حالات میں تذکرہ عوام الناس کے سامنے پیش ہوا۔ خالص اسلامی حکومت کا تصور اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ جس کے قیام کے لئے عسکری تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ قوت اور کشمکش (تنازعہ للبقا) کا ڈاروِنی تخیل قرآن مجید کے بین السطور سے نکالا گیا۔ اور ایک "عسکری جارحانہ اسلامیت" کی نشو و نما کے لئے قرآنی احکام سے استدلال کیا گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ تذکرہ میں اس "اسلامیت" کے باوجود (قولاً نہیں بلکہ عملاً) اقبال کی پیدا کی ہوئی مشرقیت کی بے حد مخالفت موجود ہے جسے درحقیقت سرسید کی تحریک احیائے مغربیت کے مرادف خیال کرنا چاہیئے۔ سرسید قدیم اسلامی نظامِ تعلیم کی پیداوار تھے اور ان کے ذہن کا پس منظر ہر حالت میں اسلامی تھا۔ لیکن المشرقی کا ذہن مغربی ماحول کا پروردہ یافتہ ہے۔ جس میں علوم اسلامیہ کی سپرٹ سے کافی ناواقفیت کا پتہ چلتا ہے اور ان کا مطمح نظر اسلام کے ماضی کے بارے میں اتنا وسیع نہیں جتنا قرآن مجید پر قلم اٹھانے والے کے لئے ضروری ہونا چاہیئے۔

تذکرہ پر علماء کی جانب سے کافی لے دے ہوئی۔[1] چونکہ قوم پر شبلی

[1] معارف ۱۹۲۵ء

اور اقبال کا اثر غالب تھا۔ اس لئے یہ کتاب مدت تک گمنامی کے پردوں
میں چھپی رہی۔ تاآنکہ المشرقی نے ایک سیاسی مجلسی تحریک کا آغاز کیا جس
کو لوگ تحریکِ خاکساراں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ علمی لحاظ سے تذکرہ
کو کوئی اہمیت حاصل نہیں بلکہ اس میں بہت سی نمایاں غلطیاں نظر آتی ہیں
لیکن تحریک خاکساراں کے رہنما کی تصنیف ہونے کے لحاظ سے تذکرہ کا
اثر بہت دوررس بلکہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ عوام کو تحریکِ خاکساراں
سے جو دلچسپی ہے وہ اس کے عسکری پہلو کی وجہ سے ہے لیکن صاحب
تذکرہ کا سارا رجحان عقل پسندی اور مادہ پرستی کی جانب ہے۔
جس سے عوام بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ سرسیّد نے صرف چند روشن
خیال حضرات کو متاثر کیا جس سے کچھ زیادہ خطرہ نہ تھا۔ اس لئے
کہ بیدار مغز اور تعلیم یافتہ لوگ بہر حال اسٹیل کے اقدار سے واقف
ہوتے ہیں لیکن عوام میں مذہب کے روحانی پہلو کے متعلق مخالفت کا جذبہ
اس کے دینی اساس کے لئے ازبس خطرناک ہوگا۔ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ
میں دینی اور اصلاحی تعلیم کے فقدان کی شکایت پہلے سے ہی کافی رنج دہ
تھی۔ لیکن تذکرہ کے اصول ان اثرات کو عوام میں بھی پیدا کرنے اور پھیلانے
کا باعث ہوں گے۔

دوسرا باب

تاریخ نگاری

"اس دور کے ادب کے متعلق ایک اور قابل ذکر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس زمانے میں تاریخ سے اور بالخصوص ہندوستان کی تاریخ سے بے اعتنائی برتی گئی" شیخ محمد اکرم صاحب کی یہ رائے "اتحاد اسلام دور" کے بارے میں ہے۔ جس سے یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ اس عام بے اعتنائی کا سبب یہ تھا۔ کہ مولانا شبلی اور ان کے رفقاء نے جو عام جذباتی فضا بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے بارے میں پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ملکی تاریخ سے عام دلچسپی نہ رہی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں اس وقت ہندوستان سے

باہر لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر توجہ نہ کی۔ "موجِ کوثر[1]" کے لائق مصنف کی یہ رائے کسی قدر احتیاط کے ساتھ قبول کرنے کے لائق ہے اسلئے کہ "اتحاد اسلام" لیڈروں نے بیرونِ ہند کے واقعات سے متاثر ہوکر جو احساسات پختہ کئے اس کا علیگڈھ اور اربابِ علی گڈھ پر ہرگز کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس وقت وطنی سیاسیات یا وطنیت سے دلچسپی اربابِ علیگڈھ کے لئے ایک شجرِ ممنوعہ تھی۔ اس لئے یہ باور کرنا کہ اربابِ علیگڈھ کے جوشِ عمل کو اتحادِ اسلام تحریک نے ٹھنڈا کر دیا غلط ہے۔

حقیقی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربیت کی تحریک نے مسلمان نوجوانوں کو ان کے شاندار ماضی سے بالکل غافل کر دیا تھا۔ ان کی نظروں میں نپولین اور ہنی بال، فریڈرک اور پیٹر دی گریٹ۔ گبن اور برکلے۔ ڈارون اور شکسپیر سما گئے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں انہیں اپنے ناموروں اور بزرگوں کے کارناموں میں کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس کی جانب مولانا شبلی نے اپنی نظموں میں بار بار اشارہ بھی کیا ہے

اس عام ذہنی غلامی نے قوم کو اپنی روایات سے غافل کر دیا جس

---

[1] موجِ کوثر ص ۱۷۴ - ۱۷۵

سے نہ صرف تاریخ بلکہ تمام علوم قدیمہ سے بے التفاتی پیدا ہو گئی۔ مگر سیّد مرحوم کی بات اور تھی۔ انہوں نے ہندوستان کیا اسلام کے عام معاملات کی طرف جو توجہ کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اپنے ہی لگائے ہوئے پودے کے اس تلخ برگ و بار کا علم نہ تھا۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی نے فرمایا ؎

نہ تھا یہ مطلب سیّد کہ اس رُخ پہ چلے دھارا

انہوں نے تاریخِ ہند کی جو شاندار خدمات انجام دیں۔ ان کے پیروؤں نے اس سلسلے کو قائم نہ رکھا۔ بلکہ یہ واقعہ نہایت افسوس کے ساتھ دیکھے جانے کے لائق ہے کہ علیگڈھ سے "سوائے سلسلۂ خسرویہ" کے آج تک کوئی علمی کارنامہ ظہور میں نہ آیا۔

ہندوستانی تاریخ کے متعلق ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیے۔ شبلی اور ان کے رفقا اس کے بے حد ممنون اور تعریف گذار ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ہندوستان تو درکنار اسلام کی صداقت اور تاریخ اسلام کے شاندار ماضی کے متعلق لاعلمی اور جہالت بلکہ تنقیص کے خیالات موجود تھے۔ پس مؤرخین اسلام کا پہلا فرض یہی تھا۔ کہ اسلام کی پرانی اور قدیم ادوار کی تاریخ کو اردو میں منتقل کریں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ دورِ مغربیت کے خلاف ردِّ عمل کا دور تھا۔ اسلئے

عام مفکرین کا نعرۂ جنگ "باز گو از نجد و از یارانِ نجد" تھا۔

اسی جذبہ کے ماتحت شبلی نے سیرۃ النبیؐ لکھی اور اسلام کے دوسرے ناموروں کے حالات قلمبند کیئے۔ دارالمصنفین کا مقصد خود ناظم دارالمصنفین کی زبان میں یہ تھا "ہمارا مقصد صرف زبان اردو کے سرمایہ کی ترقی نہیں ہے بلکہ ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا کرنا ہے جو قوم کی دماغی قوتوں کے نشوونما کا سامان کر سکے[۱]۔ انہوں نے قوم کی دماغی قوتوں کی نشوونما کیلئے اور اسلامی ذہن تیار کرنے کے لیئے اسلام سے ابتدار کی اور قرونِ اولی کی اسلامی تاریخ کو اپنے سامنے رکھا جس کے بغیر صحابہ تابعین اور متقدمین کا فکر و ذہن نئی نسلوں میں منعکس نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسی غرض سے صحابہ تابعین، انصار، صحابیات اور مہاجرین کی زندگیاں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے حالات اور اسی نوع کی چند اور کتابیں رفقائے شبلی کے قلم سے اردو زبان[۲] میں نکلیں۔ جامعہ ملیہ سے نکلی ہوئی کتاب تاریخ الامہ کو بھی اسی صف میں شمار کرنا چاہیئے۔

تحریکِ خلافت میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد نے اس بات کی ضرورت پیدا کی کہ ان دو اقوام کے قدیم تاریخی تعلقات پر نظر ڈالی جائے

۱؎ معارف ستمبر ۱۹۱۶ء مضمون "خواب تمنا" یا دارالمصنفین) ۲؎ مولانا ندوی کی کتاب تاریخ الاسلام (۳ جلد) تاریخ سندھ۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تاریخ اسلام۔

اسی ضرورت کا نتیجہ مولانا سلیمان کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" ہے:
شیخ اکرام صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ "جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔
اس میں شائع شدہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے تاریخی مباحث پر نسبتاً
بہت کم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور ہندوستان کے متعلق جو اس زمانے کی
تاریخی کتابیں ہیں۔ ان کی تعداد تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے"۔ (موجِ کوثر
ص ۱۷۷) یہ ایک المناک واقعہ ہے۔ کہ ہندوستان کی تاریخ پر الٰہ آباد سے
بہت سی کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن اردو زبان
ابھی تک ہندوستان کی مستند تاریخوں سے محروم ہے۔ سید
ہاشمی فرید آبادی[1] اور مولوی غلام طیب[2] وغیرہ نے درسی مقاصد سے
کچھ کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں محققانہ شان نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے
تاریخی ترجمے گو لائق تحسین ہیں لیکن ترجمے آخر ترجمے ہیں۔

تحریکِ ترکِ موالات کے زوال کے بعد ہندوستان میں پہلے فرقہ
بندی اور پھر صوبہ پرستی کا جذبہ فروغ پذیر ہوا۔ مہاراشٹر اور جنوبی ہندوستان
میں سیواجی کو ہیرو بنانے کی تحریک تلک نے پیدا کی تھی۔ چنانچہ انگریزی اور
مرہٹی میں بہت سی کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔ مسلمانوں میں اس کا
ردِ عمل ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ زیرِ بحث دور میں دکن کے بعض نامور

---

[1] تاریخ ہند، [2] دیس کہانی

کے متعلق عمدہ کتابیں لکھنے میں آئیں۔ مثلاً "سلطانِ شہید" از محمود بنگلوری "چاند بی بی" از احمد قادری، "ملک عنبر" از شیخ چاند۔ "تاریخ سلطنتِ خداداد" از محمود بنگلوری۔ "ملیبار" از شمس اللہ قادری۔ اسی طرح شمال میں بھی بعض معمولی رسالے شائع ہوئے ہیں جن کو نظر انداز کر دینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ (علی الخصوص تاریخ اسلام) کے بارے میں اگرچہ ذوق کی کمی افسوسناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ تاہم ادھر ادھر انگریزی زبان میں ہندوستان اور اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں جن میں تاریخ کے سائنٹیفک اصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ پنجاب میں اورینٹل کالج لاہور کے بزرگوں کی وجہ سے تحقیق علمی اور تاریخ کا نمایاں ذوق پیدا ہوا جس کی وجہ سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ کسی نہ کسی دن اردو زبان کو تحقیق و تدقیق کے نئے طریقوں سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ کسی اچھی تاریخ کی ترتیب و تدوین کیلئے جو اوریجنل مواد یا ذخیرۂ کتب درکار ہوتا ہے وہ بہت محنت سے مہیا کیا جا رہا ہے۔

فنِ سیرۃ (بیاگرافی) میں بھی عمدہ تصانیف کی بہت کمی ہے۔ اس دور کی ایک خصوصیت "غالب پسندی" ہے جو بقول شیخ اکرام اس دور کے "جذباتی نقطۂ نظر"[۱] کا نتیجہ ہے۔ مرزا غالب کے متعلق اتحادِ اسلام

---

[۱] موجِ کوثر ص ۱۷۲

دَور میں جو والہانہ عقیدت پیدا ہوئی۔ اس کا اثر تحریکِ ترکِ موالات کے بعد تک رہا۔ اور اگرچہ اب اس محبت کے خلاف کسی قدر ردِ عمل محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن مرزا غالب ابھی تک دل و دماغ پر غالب ہیں۔ اس غالب پسندی کے زیرِ اثر مرزا کی کچھ سوانح عمریاں۔ کچھ شرحیں، کچھ عمدہ ایڈیشن (مثل مرقعِ چغتائی۔ مصور ایڈیشن) شائع ہوئے۔ ڈاکٹر لطیف (حیدر آباد) نے انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی جس کا مقصد غالب کی عظمت کو گرانا تھا۔ محاسنِ کلامِ غالب (بجنوری) اور غالب (لطیف) کے درمیان متوسط اور معتدل راستے کی ضرورت سے متاثر ہو کر شیخ اکرام صاحب نے 'غالب نامہ' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سیرۃ نگاری کے اعلیٰ اصول و قواعد پر عمل کرتے ہوئے مرزا غالب کی زندگی پر ارتقائی اور نفسیاتی نظر ڈالی گئی ہے۔ غالب کی سوانح عمری میں شاید یہ پہلی کتاب ہے جس میں مرزا کو ان کے حقیقی خط و خال اور ان کی ہو بہو بشریت کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے قریب قریب دَور میں مولانا غلام رسول صاحب مہر نے مرزا غالب کی اپنی تحریرات سے ایک لائف تیار کی جس کا نام 'غالب' رکھا[1]۔ یہ کوشش بھی اپنے رنگ میں ایک کامیاب اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ مالک رام کی کتاب

---

[1] رامپور سے غالب کے خطوط کا مجموعہ مکاتیبِ غالب کے نام سے شائع ہوا ہے۔

"ذکرِ غالب" بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

مشرق اور مغرب میں عمر خیام کے سلسلے میں جو دلچسپی لی جا رہی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا ذوق اب روز بروز انحطاط پذیر ہے۔ تاہم ابھی تک علمائے یورپ کی مہربانی سے کلیۃً مفقود نہیں ہوا۔ فٹز جیرلڈ کے ترجمہ رباعیات کے بعد عمر خیام انگریزی ادب کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ جس سے اہلِ مغرب کافی محظوظ ہوتے ہیں گذشتہ بیس پچیس سال میں انگریزی زبان میں اس حکیم نیشاپوری کے متعلق اچھا خاصہ کام ہو چکا ہے۔ چنانچہ رباعیات کے بہت سے عمدہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ اور پرانے سے پرانے قدیم نسخوں کی تلاش اب بھی ہو رہی ہے۔

افسوس ہے کہ اردو زبان اس دانائے راز کے حالات و کوائف سے بالکل محروم تھی۔ بالآخر اسی دور میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے ایک مفصل اور مبسوط کتاب "خیام" کے متعلق شائع کی جس میں نہ صرف اس شاعر کے حالاتِ زندگی ہیں بلکہ خیامیات کے ہر پہلو پر بحث موجود ہے بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ یہ سید صاحب کی بہترین تصنیف ہے اور بظاہر اس رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

تیسرا باب

تاریخ ادب و تنقید

اس دور کا یہ ایک روشن پہلو ہے کہ اس میں زبانِ اردو کی ابتداء اور تاریخ کے متعلق خاص توجہ کی گئی۔ جنگِ عظیم سے پہلے اس معاملہ میں ہمارا کل سرمایہ آبحیاتِ آزاد یا چند اور متفرق رسالے تھے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۰ء کے درمیان یہ کمی کسی حد تک پوری ہوگئی۔ غالباً شعر العجم کے تخیّل سے متاثر ہو کر دار المصنفین نے سب سے پہلے گلِ رعنا۔ پھر شعر الہند شائع کی۔ پہلی کتاب مولانا عبدالحی اور دوسری مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف ہے۔ ان دونوں کتابوں کا مضمون وہی ہے۔ جو آبحیات کا ہے۔ گلِ رعنا کی تحقیق قدیم اردو اور قدیم شاعری کے بارے

میں بہت کچھ قدر کے قابل ہے۔

۱۹۲۷ء میں مسٹر رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں اردو ادب کی مفصل تاریخ لکھی جس کا ترجمہ مرزا عسکری نے اردو زبان میں ۱۹۲۱ء میں کیا۔ یہ کتاب ہماری زبان کی جامع ترین تصنیف ہے۔ جو مسامحات اور خامیوں سے اگرچہ پاک نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ اس میں پہلی دفعہ سارے ادبی کارناموں پر مجموعی نظر ڈالی گئی ہے۔ بہت لائق تحسین ہے۔

تنقید ادب کے متعلق ڈاکٹر محی الدین قادری کی کتابیں تنقیدی مقالات، اور اردو کے اسالیب بیان۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مقدمات اور ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب Influence of English litrature on urdu litrature مہدی حسن کے مضامین دافادات خاص توجہ اور مطالعہ کے لائق ہیں۔ پنجاب اور ہندوستان کے رسائل میں بعض نوجوان ادیبوں کے قلم سے عمدہ تنقیدی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں اصول کی پابندی اور ذہن کی روشنی یکجا نظر آتی ہے۔ توقع ہے کہ ان میں سے بعض حضرات کا ذکر آئندہ کے مؤرخ اپنی کتابوں میں کریں گے۔

موجودہ دور کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں مولانا حالی کی شخصیت کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش عمل میں آئی۔ دکن میں ڈاکٹر

مولوی عبدالحق صاحب نے مولانا حالی کی ادبی خدمات کو واضح تر صورت میں پیش کیا۔ اور ان کے کارناموں کو نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسدس حالی کے عمدہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ مکاتیب حالی اور مقالاتِ حالی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اور رسالہ اردو (اورنگ آباد) کا حالی نمبر اس پر مستزاد ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں مولانا حالی کی طرف یہ توجہ شبلی کی مخالفت کا پہلو لئے ہوئے ہے لیکن اس خیال کا بالفرض اگر اعتراف بھی کر لیا جائے۔ تب بھی یہ کوششیں ادب کے لئے مفید ہیں۔

اس دور میں جیسے کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ زبان اردو کے ابتدائی مولد و موطن کے متعلق بہت علمی تحقیق ظہور میں آئی۔ اس سلسلے کا شاندار اور اہم ترین کارنامہ "پنجاب میں اردو" ہے جس میں ہمارے مخدوم حافظ محمود خاں صاحب شیرانی نے منظم اور باقاعدہ طور پر پہلی دفعہ پنجاب کو اردو کا ابتدائی اور اصلی وطن قرار دیا ہے۔ تاریخی دلائل و قیاسات اور لسانی خصوصیات و شواہد کی بنا پر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا[1]۔ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اس میل جول کا سب سے پہلا میدان پنجاب

---

[1] پروفیسر گراہم بیلی نے اپنی کتاب Urdu Literature میں اس نظریہ سے اتفاق کیا ہے۔

ہے جہاں غزنویہ دور میں ہندو مسلم اختلاط واقع ہوا۔

اس سے قبل اسی نوع کی ایک کتاب "دکن میں اردو" (۱۹۲۵ء) نصیر الدین صاحب ہاشمی کے قلم سے نکلی جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اردو نے دکن میں ایک باقاعدہ زبان بننے کا فخر حاصل کیا۔ اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری (۱۹۲۶ء) بھی بہت اہم کتابوں میں سے ہے[۱] قدیم اردو، دکنی، گوجری وغیرہ کے متعلق تحقیق کا سلسلہ جاری ہے اس سلسلہ میں پروفیسر محمود خان صاحب شیرانی کی کوششیں خاص طور پر قابلِ داد ہیں۔ بلاشبہ آپ اس میدان میں ایک انقلابی رہنما کا درجہ رکھتے ہیں۔

۱؎ اس مضمون پر چند اور کتابوں کے نام یہ ہیں: سیر المصنفین از تمنا۔ ارباب نثر از سید محمد (۱۹۲۵ء) اردو شہ پارے از ڈاکٹر محی الدین زور (۱۹۳۰ء) مغل اور اردو از نواب نصیر حسین خیال، یورپ میں دکھنی مخطوطے از نصیر الدین ہاشمی، اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ قدیم اردو کی کتابیں، منشورات کیفی (۱۹۳۵ء) وغیرہ

چوتھا باب

شاعری

۱۹۱۸ء میں جب جنگِ عظیم کے شعلے بجھے ۔ تو ہماری شاعری[1] کی دنیا میں چند بزرگ ایسے تھے ۔ جن کی سخنوری عروجِ کمال پر پہنچ چکی تھی اور باوجودیکہ تب بھی ان کی زبان خاموش نہ تھی لیکن ان کی شاعری اپنا کام ختم کر چکی تھی ۔ مثلاً اکبر الہ آبادی اور چکبست لکھنوی، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے ساز میں ابھی کچھ راگنیاں باقی تھیں اور اگرچہ ان کی نوائے درد میں وہ پرانا اثر باقی نہ تھا ۔ تاہم خم میں کسی قدر

[1] شاعری کے سلسلے میں پروفیسر فراق کا مضمون "نئے ادب میں غزل کی جگہ" پیشِ نظر رہا جس کے لئے اظہارِ شکریہ کیا جاتا ہے ۔

ے باقی تھی۔ اس لئے ان کے شعر لذت سے خالی نہ تھے۔ مثلاً اقبال،
حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ یاس عظیم آبادی۔ ظفر علی خاں۔ عزیز۔ پھر ایک
جماعت ایسی بھی تھی جس کے دلوں میں نئے نغمے اٹھ رہے تھے۔ اور
درد کی صدائیں اظہار کے لئے نئے انداز تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن
ہنوز پرانے شاعروں کے سامنے ان کا چراغ جل نہ سکتا تھا۔ مثلاً
جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی وغیرہ جن کے زمرے میں کچھ سال بعد
نوجوان شعرار مثلاً اختر شیرانی حفیظ جالندھری اور احسان بن دانش
بھی شامل ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے بعض نوجوان شعرار وقت کا نیا
پیغام لے کر اٹھے ہیں جن کے نزدیک شاعری یا ادب اور زندگی میں
چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جن کا عقیدہ ہے کہ ہم "اصلیت یا حقیقت نگاری
کو اپنے ادب یا آرٹ کا اولی اور اہم جزو بنائیں"[1]۔ یہ مشہور نظم گو شعرار روش
صدیقی، مجاز، علی سردار۔ الطاف مشہدی، جذبی فیض وغیرہ ہیں۔

اقبال اقبال اتحاد اسلام دور کے شاعر ہیں۔ شمع و شاعر کے
بعد ان کی شاعرانہ عظمت کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ ان کی شاعری
کو وقت کی ضرورتوں سے پورا لگاؤ تھا۔ وہ اس دور کی اسلامی
حسیات کے پورے ترجمان ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کے حساس طبقے جو

[1] رسالہ اردو ۱۹۳۶ء مضمون "آرٹ کا ترقی پسند نظریہ" از احمد علی ایم۔ اے

سوچتے یا محسوس کرتے تھے۔ اقبال ان کو موزوں شکل میں ڈھال لیتے ہیں غزل سے اقبال کو اگرچہ زیادہ دلچسپی نہیں لیکن جنگ عظیم سے قبل اور بعد انہوں نے بہت سی غزلیات لکھی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں خضر راہ اور اس کے دوسرے سال اقبال نے طلوعِ اسلام لکھی۔ یہ بھی وقت اور زمانے کی راگنی تھی۔ اس کے بعد اقبال نے اپنے پیام کو مشرق کا پیام بنانے کے لیے اردو کو ترک کر دیا اور فارسی زبان اختیار کر لی قدردانان اردو یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ اقبال نے اپنے اس عمل سے ہندوستانی زبان کو بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اعمال کسی نہ کسی غایت کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لیے رائے زنی کرنے کے لئے ان غایات پر نظر رکھنی چاہیے۔ سنہ ۱۹۲۳ء اور اس کے بعد کی سیاسیات میں بنگال کے ایک مشہور لیڈر سی۔ آر۔ داس آنجہانی نے تمام ایشیائی اقوام کو مغرب کے خلاف متحد کرنے کے لیے "آل ایشیا فیڈریشن" کی تجویز پیش کی تھی۔ اس زمانے میں اسلامی ملک ایک سیاسی بحران میں مبتلا تھے۔ لہذا مسلمانانِ ہند کو ایشیا کی تمام اقوام کے ساتھ ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے اقبال کا فارسی کو اپنی زبان قرار دے دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ آخری عمر میں اقبال نے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم لکھ کر اردو والوں کی کچھ اشک شوئی کی ہے۔ لیکن میں

خیال کرتا ہوں کہ اس سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

میں مذہبی فکر کی بحث میں لکھ آیا ہوں کہ اقبال کو مجموعی حیثیت سے شاعر کہنا درست نہیں۔ بلکہ ان کے لیے "مفکر" یا "حکیم" کا لقب موزوں تر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے حکیمانہ افکار کے لیے شعر کا پیمانہ تلاش کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے بلند خیالات کے لیے شعر کی قبا تنگ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مشکل نگاری اور دقت پسندی ان کے کلام کی خصوصیات میں ہے۔ اردو کی غزلیات میں سلاست ضرور ہے لیکن وہ ہیں کتنی؟

اس موقعہ پر میں اپنے "ترقی پسند" دوست احمد علی ایم۔ اے کی رائے اقبال کے متعلق لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں جن کے طائرِ خیال نے ترقی پسندی کے جوش میں بہت بلند فضاؤں میں پرواز کی ہے ٹیگور کی شاعری کا ذکر کر چکنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اقبال کی شاعری حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ زوردار ہے۔ زیادہ خیالی (utopian) ہے۔ اس ماضی کے عشق میں جو اپنے مردے کبھی کا دفن کر چکا ہے۔ اقبال اسلام کے سنج و محن کے ترانے گاتے ہیں۔ ایک ناممکن اور بے معنی پین اسلامزم (Pan Islamism) کی دعوت دیتے

ہیں اور چیختے چلاتے، روتے دھمکاتے، قدیم گل وبلبل کے گیت گاتے داکثر بڑی خوش الحانی سے) اس مرکز کی طرف آ جاتے ہیں جو بڑی حد تک اس قسم کی شاعری کے وجود اور الہام کا بانی مبانی ہے یعنی اسرارِ خودی لیکن باوجود شکووں اور جوابِ شکووں کے باوجود آہ وبکا اور آنسوؤں اور التجاؤں کے وہ جو تھا کبھی واپس نہیں آسکتا۔ داقبال تو اس میں کامیاب ہوئے نہیں) اور حقیقت جو ہے رہیگی۔۔۔۔"

"ٹیگور اور اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے۔ اور حقیقت کو بہلانے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے اور باوجود اپنی خوبصورتی کے محض خواب وخیال ہے۔۔۔۔۔"

(از آرٹ کا ترقی پسند نظریہ)[۵۱]

میں ٹیگور کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کم از کم اقبال کے متعلق یہ رائے بالکل غلط معلوم ہوتی ہے۔ اقبال جس ماضی کو واپس بلا رہا ہے۔ وہ ماضی بہت پرانا نہیں بلکہ ماضی قریب ہے جس کے آثار خطّہ مختلف شکلوں اور مختلف رنگوں میں اس سرزمین کے چپے چپے پر موجود ہیں

---

[۵۱] رسالہ اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

اقبال کی شاعری احمد علی صاحب کے لئے خیالی سہی لیکن وہ پہلے تو خود اپنی زندگی میں دیکھ لیں گے ورنہ مرنے کے بعد نہ خاک ان کی چشمِ جہاں بیں دیکھ لے گی کہ یہ پیغام کسی Utopia جنّت خیالی کی تعمیر کے لئے نہیں بلکہ اس فردوسِ "گم گشتہ" کی تشکیلِ نو کے لئے ہے جس کی دیواریں اور چھت تو گرچکی ہے لیکن جس کے نقوش ابھی باقی ہیں جن پر پھر عمارت کا ڈھانچہ قائم ہوسکتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ احمد علی صاحب کی نگاہیں روسی اور مغربی خیالات کی جھوٹی آب و تاب سے اس درجہ خیرہ ہوگئی ہیں کہ وہ حقیقت اور گرد و پیش ہر دو کی حقیقت سے بے خبر ہوگئے ہیں۔

ہمیں تو پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ کہ "یہ سب سہی پھر بھی ان کے کام کی قدر و قیمت کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ ان کی غزلوں میں اور خاصکر بعد کی غزلوں میں شکتی سنچار اور شکتی سادھن ہے۔ ان کی غزلوں میں فولاد کے ان پگھلے ہوئے ٹکڑوں کو ہضم کرنا ہمارے جگ جگانتر کے روگوں کو مٹا دے گا اور ہماری زندگی میں وہ کس بل پیدا کرے گا۔ کہ اقبال کے پیغام کے خطرناک محرکات سے بچتے ہوئے اور فتح حاصل کرتے ہوئے آگے بڑھ سکیں گے۔ اس لئے ابھی اقبال کا خنجر تو وقت کے سینے میں اُترتا جائے گا۔ لیکن حسرت۔ اصغر، یاس، و یگانہ، فانی۔ جگر، وغیرہ کا کام ختم ہوچکا"۔[۵۱]

۵۱ رسالہ نیا ادب لکھنؤ ص ۲۳، پرچہ جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۴۰ء

بے شک "اقبال کا خنجر وقت کے سینے میں اتر تا جائے گا!"——

نہیں بلکہ اقبال کا خنجر وقت کے سینے میں اُتر چکا ہے۔ ہنوز اس کے اثرات اولین ہیں۔ آگے جو ہوگا۔ اس کو میرا قلم لکھنے سے قاصر ہے سہ

باش تا آفتاب پیدا شود

کیں ہنوز از نتائج سحر است

حسرت، اقبال، یاس یگانہ، اصغر، فانی، جگر اور ظفر علی خاں کا دور لگ بھگ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۵ء تک ممتد ہوتا ہے۔ ان میں سے اقبال کا ذکر آچکا۔ ظفر علی خاں لکھتے تو بہت اچھا لکھتے۔ شاید جوش اور سوز میں اقبال سے پیچھے نہ رہتے۔ لیکن وقتی معاملات پر طبع آزمائی اور ہجویات اور طنزیات نے انہیں معاصرین میں (خاص طور پر جمہور کے اس بار) انہیں مقبول نہیں رہنے دیا۔

میرے خیال میں یہ ایک بہت بڑی بے انصافی ہے کہ ہم ان کو اس دور کے شعراء کی صف سے نظر انداز کر دیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے غزلیات لکھیں جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ظفر علی خاں نے ان کے مقابلہ میں ہمارے ادب میں بعض نہایت بلند پایہ سیاسی نظموں کا اضافہ کیا ہے۔ جہاں تک نادر قافیوں پر قدرت کا تعلق ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بعد شاید ہی کوئی آدمی ان کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے[۱]

[۱] ان کی نظموں کا مجموعہ بہارستان شائع ہو چکا ہے۔

حسرت موہانی

حسرت موہانی کا بہت سا کلام اسیری کا رہینِ منت ہے جس کی جبری فرصت اکثر اہلِ فن کے لئے مغتنمات میں سے ہوا کرتی ہے۔ ان کا کل سرمایہ غزلیات پر مشتمل ہے ان کو "اردو زبان کا حافظ" کہا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دریا کے اس پار تنہائی میں کوئی شخص ساز محبت کے مدّھم تاروں کو چھیڑ رہا ہو۔ وہ رنگین ہیں مگر سادہ، سادہ ہیں مگر رنگین۔ پھر اصلیت بھی ہے اور واقعہ نگاری بھی۔ ان کا عاشق فرشتہ نہیں انسان ہے ان کی شاعری میں بام اور آنچل کے مضمون بہت ہیں۔ سچا عشق ہے اور حقیقی سوز و گداز! سیاست کی الجھنوں اور مشقتوں کے باوجود ڈاکٹر "نسیم وکن" کو پیغام بر بناتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کو اشارتاً کہہ دیتے ہیں کہ جو لکھ رہا ہوں وہ سچے جذبات کا نتیجہ ہے۔ ان میں فلسفیانہ اور مفکرانہ شان نہیں لیکن بقول پروفیسر فراق "اتنی نرم اور رچی ہوئی غزل گوئی اور اتنی حیرت انگیز پختگی کسی کے یہاں نہیں"۔ حسرت کا عاشق ہمیشہ پُرامید رہتا ہے۔ دوریِ منزل اسے مایوس نہیں کرتی۔ اسے ناکامیاں مغموم نہیں ہونے دیتیں۔ اس کا شوق اور اس کی طلب زیادہ سے زیادہ تر ہوتی جاتی ہے حسرت کی شاعری کو کبھی بیمار شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ کسی معنی میں بیمار نہیں ——— نہ جسمانی نہ روحانی ——— ! حسرت

ہوس اور عشق میں امتیاز کرتا ہے اور محبت کا وہ نصب العین مقرر کرتا ہے جو رندانِ بوالہوس کو ناپسند ہو تو ہو لیکن اہلِ طلب کے لئے لذتِ طلب اور ذوق وصال کا ایک وسیع میدان کھول دیتا ہے ؎

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حسرت کیا ہے؟
ان سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

یہ شعر پڑھ کر نظیری کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

نظیری کوے عشق است این نہ شاہد بازی و رندی
کہ گریارے رود از دست کس یار دگر گیرد

لفکاڈیو ہرن کا یہ قول کہ سچا عشق انسان کی سیرت میں اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے۔ حسرت کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ زندگی جو طلب تڑپ۔ درد اور اسیری میں گزری وہ زندگی جس کی شانِ بے نیازی نے اُسے کبھی امیر و وزیر کے دروازے کا سائل نہیں ہونے دیا۔ وہ زندگی جس نے آزادی اور حریت کے لئے سب کچھ قربان کرنے پر مائل کر دیا ؎

گذاری عمر شغل عاشقی میں مرحبا حسرتؔ[۱]
نہ پاس آنے دیا غمہائے بے پایانِ دنیا کو

---

[۱] حسرت کا بہت سا کلام جنگ عظیم سے پہلے کا ہے لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے جو مطبوعہ صورت میں ملتا ہے۔ کاش۔ اس کی طباعت کا کچھ بہتر انتظام ہو سکتا۔

اصغر اصغر گونڈوی جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ مفکّرانہ غزل گوئی کے استاد ہیں۔ اُن کے کلام کے دو مجموعے نشاطِ روح اور سرودِ زندگی شائع ہو چکے ہیں۔ سرودِ زندگی کا دیباچہ مولانا ابوالکلام نے لکھا ہے۔

اصغر نے غزل کو مذہبِ روحانیت کا پیامبر بنایا ہے جس میں لطافت سراپا لطافت ہے۔ اور اگرچہ اس میں مایوسی نہیں لیکن زندگی کی چنگاری بھی نہیں کہیں کہیں تابانی تو پیدا ہوتی ہے لیکن گرمی نہیں پیدا ہوتی۔ ان کی غزل میں جوئے کہسار کی تندی اور تیزی اور جوش و خروش نہیں۔ وہ راوی کی طرح نرم سیر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ باطن میں بے پناہ طوفان اُٹھ رہے ہوں لیکن سطح ساکن ہے۔ بقول پروفیسر فراقؔ "اصغر کے تصور نے نزاکت اور لطافت، سچائی اور حقیقت کو ایک پرچھائیں یا ایک موج رنگ و بو بنا کے چھوڑ دیا۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ در لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کرنہیں سکتی۔"

یاس عظیم آبادی یاسؔ یگانہ لکھنؤ کے فرزند ہیں دشاعری میں لکھنؤ کے آخری غزل گو عزیز ہوئے ہیں جن کے ہاں قبرستان اور مزار، جنازہ اور غمکدہ آہیں اور نالے سب کچھ موجود ہے۔ یاس ایک مدت تک اسی مزار کے مجاور بن کر بیٹھے رہے

لیکن مزار کی اداسی۔ فضا کی افسردگی اور دیے کی تاریک روشنی سے گھبرا کر انہوں نے اپنے خرمن میں وہ آگ لگائی کہ لکھنؤ کی شاعری کا گھر اپنی ہی آگ میں جل بجھا۔ ———— یا اس سے پہلے خوفناک تاریکی کی اداسی میں تھے۔ اب بھیانک روشنی نے انہیں خیرہ کر رکھا ہے کوئی معیّن راستہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے "

فانی فانی بھی لکھنؤ سے متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی چھوڑ کر موت کی تلاش میں پھرتے ہیں ؎

موت ملے تو مفت نہ لوں اس ہستی کی کیا ہستی ہے

موت میں زندگی اور زندگی میں موت۔ لیکن جو کچھ کہتے ہیں۔ دل میں کھب جاتا ہے اور جیتے آدمی اس غور و فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ کہ واقعی ہستی اصل ہستی نہیں۔ اس کے دروازے جب بند ہو جائیں گے پھر کہیں حقیقی زندگی تک پہنچ سکیں گے۔

مایۂ ادراک ہستی ہوں تکلف برطرف
زندگی میری دروغ مصلحت آمیز ہے

فانی کا غم مصنوعی نہیں۔ اس میں سچائی کی جھلک ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ فانی اکثر روتے رہتے ہیں اور یہ روح کی پژمردگی کا باعث

سلہ ان کا کلام چھپ چکا ہے۔ باقیات فانی۔ عرفانیات فانی حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

ہے لیکن فانی کی روح پژمردہ کب نہ تھی؟ وہ جیسے امید کے باغ کا ایک پھول بھی نہ ملا ہو۔ وہ جس کے تاریک غم خانے میں خوشی کا دیا کبھی ضوفشاں نہ ہوا ہو۔ وہ جس کی نگاہیں مسرتوں کے نور سے کبھی آشنا نہ ہوئی ہوں۔ وہ الم نصیب کیسے جھوٹی خوشی کے ترانے گائے محض اس لئے ہ کہ آپ اس خوشی سے خوش ہوتے ہیں۔ وہ تو کہتا ہے ؎

فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی ہے یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

پھر بھی جب کبھی اپنے غم کو بھولتے ہیں تو آپ کے لئے جھوٹی امید کا پیغام چھوڑ جاتے ہیں ؎

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

جگر مرادآبادی

اب رہے جگر مرادآبادی۔ سو وہ "بقول شخصے جب بہک کر کہتے ہیں تو اچھا کہتے ہیں اور جب سنبھل کر کہتے ہیں۔ تو اچھا نہیں کہتے"۔ ان کو شعر کے لئے مستی کی ضرورت ہے اور یہی مستی ان کی ہوشیاری کا سرچشمہ ہے۔ محبت کے مسائل، محبوب کے ذکر کے ہزار ہا پیرائے جذبات عشق میں لطف! ان کے شعر میں مے کی تابانی اور بادۂ گلفام کی خوشبو ہے۔ ان کی شاعری کو بیمار تو نہیں

کہہ سکتے ۔ لیکن وہ دیوانگی کے اثرات سے خالی نہیں ۔ حضرت فراقی کے الفاظ میں[1] "اس میں ایک ایسی ہیجانیت ہے اور رد و کد تھام کی ایک ایسی کمی ہے جو صحت اور تندرستی کی نشانی نہیں ۔ ان کی شاعری کی یہ بھبھک اور یہ اُبال اچھی لگتے ہوئے بھی اچھی نہیں لگتی" ۔ وہ ہیجانی جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ ان میں توازن کی بہت کمی ہے اور اگرچہ وہ لکھنؤ کی محبوبیت سے مبرا ہیں ۔ لیکن ان کی شاعری کسی اعلیٰ مجموعی معنویت سے محروم ہے[2] ۔

جوش جوش ملیح آبادی (جو اب شاعرِ انقلاب کہلاتے ہیں پہلے غزل گو شاعر تھے ۔ انقلاب زمانہ سے ان کی شاعری میں بھی انقلاب آ گیا ہے ۔ ان کی غزل میں ایک مردانہ وار احساس موجود ہے ۔ وہ اقبال کی طرح غیور اور پُر جوش اور محبت کی دنیا میں بھی احساسِ برتری لے کر جاتے ہیں ۔ ان کی فطرت ناقابلِ تسخیر ہے ان کا دل محبت کرتا ہے لیکن حاکمانہ ، وہ عشق میں بھی غلامی کے روادار نہیں ۔ بقول غالب ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئیں درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

---

[1] ایضاً [2] ان کا کلام شعلۂ طور شائع ہو چکا ہے ۔

تعجب تو یہ ہے کہ انہوں نے شروع سے ہی محبت کی داستانوں کو خیرباد کیوں نہ کہا وہ اس دنیا کے لائق نہیں ہیں۔ جہاں بادشاہوں کو بھی نیازمندی ہی زیب دیتی ہے۔ ان کے اشہب فکر کی جولانی کے لئے موجودہ بے کسی اور بے چارگی کی بے پایاں ہندوستانی وسعتیں درکار تھیں۔ جن کی تسخیر کے لئے آخر وہ میدان میں آہی گئے۔

اب حضرت جوشؔ نے غزل سے ہٹ کر نظم کی طرف توجہ کی ہے جس میں وہ ہندوستان کی موجودہ زندگی کی حقیقتیں واضح کرتے ہوئے ان کا حل پیش کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔ نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط وغیرہ

حفیظ۔ اختر۔ احسان

پنجاب کے چند شعرا جن میں سے بعض اپنی زندگی کا کام ختم کر چکے ہیں۔ اس لائق ہیں کہ اس تذکرہ میں شامل کر لئے جائیں۔ حفیظ جالندہری جو اپنی غزلیات کے سوز و لذت کو ترنم سے دوبالا کیا کرتے تھے۔ آخر "فردوسی اسلام" بن گئے۔ ان کی منظوم تاریخ "شاہنامہ اسلام" کچھ چھپ گئی اور کچھ باقی ہے۔ شاعر نے اس گراں قدر تصنیف سے عقبیٰ کا زاد راہ تیار تو کیا۔ لیکن اسی ثواب اندوزی کے جرم میں اب موجودہ زمانے کی گناہ گار مخلوق ان کو شعرا کے زمرہ سے نکال رہی ہے

ان کا سلام خاص و عام میں مقبول ہے بلکہ ریکارڈوں کی زینت بھی بن چکا ہے۔

اختر شیرانی کو بہار کا "گل پژمردہ" کہنا چاہیئے۔ نظم، سانیٹ، ترکیب بند، مستزاد میں پُرجوش اور جذبات سے معمور نغمے گانے کے بعد جگر مراد آبادی کی بستی کی طرف چل دیئے۔ جہاں ان کی شاعری ان کی زندگی کی نذر ہو گئی۔ ان کے اشعار میں مقامی رنگ بہت ہے۔ وہ ڈی۔ ایچ لارنس کے مداح اور پیرو ہیں ——— کسی خیالی یا حقیقی سلمٰی کے نشانِ کفِ پا کا سراغ لگاتے راستے سے بھٹک گئے۔ اب کسے معلوم پرانے راستے پہ آ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ سلمٰی کی ناقہ کی اب چل دی ——— اور معلوم نہیں کب واپس آئے!

احسان بن دانش مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے غم میں گھلتے ہیں۔ وہ بےبسی اور بےکسی کے مرثیے اپنی مہیب آواز سے سنا کر سامعین کو کچھ دیر تک غریبوں اور مزدوروں کا ہمدرد بنا لیتے ہیں۔ توقع ہے کہ ابھی بہت کام کریں گے۔

شاعری کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے

[1] ان کی نظموں کا مجموعہ نغمۂ حرم کے نام سے شائع ہوا ہے۔

کہ کچھ برسوں سے غزل کے خلاف ایک فضا پیدا ہوگئی ہے جو اس احساس کا نتیجہ ہے کہ غزل کو اب ہماری زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ نظم گوئی کی طرف (بلکہ بے قافیہ نظموں کی طرف) رجحان کافی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ ان نظم گو شعرا میں روش صدیقی۔ مجاز، علی سردار، احسان بن دانش، الطاف مشہدی، جذبی، فیض وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری نئی شاعری کے سہانے نام سے ہمارے سامنے آرہی ہے اور ہمیں یہ باور کرایا جارہا ہے کہ اس سے ادب اور زندگی میں ایک علاقہ پیدا ہوگا اور جونہی کہ یہ علاقہ استوار ہوا ہماری سب مصیبتیں دور ہوجائیں گی۔ میں مانتا ہوں۔ نظم شاعری کی عمارت میں ایک اہم رُکن کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن نظم اور غزل کے درمیان جو جنگ قائم کی جارہی ہے۔ میں اسے اردو شاعری کے لئے نیک فال نہیں خیال کرتا۔ نظم کو اپنی جگہ پھیلنا اور ترقی کرنا چاہیئے۔ اور غزل کو اپنی جگہ اپنی وسعتوں کو سمیٹنا چاہیئے۔ بعض لوگ سنی سنائی باتوں پہ یہ کہ دیتے ہیں کہ غزل عورتوں سے باتیں کرنے کا نام ہے۔ اور یہ کام اتنا زیادہ ہوچکا ہے کہ اب اس کے امکانات ختم ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ غزل باوجود اپنے ایجاز و اختصار کے نہایت

وسیع چیز ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی توضیح ہو تی رہی ہے اور ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال کی بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں نئے دور کی غزلوں کی وہ مثالیں موجود ہیں جن میں زندگی کے اہم مسائل کو چھیڑا گیا ہے اور پھر آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ غزلیں نہیں۔

بات یہ ہے۔ کہ حسرتؔ۔ فانیؔ۔ اقبالؔ اور دوسرے غزل گوؤں نے غزل کا معیار اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس کی بلندیوں تک پہنچنا اب ہر شاعر مشاعرہ کا کام نہیں۔ اب بلند غزل لکھنے کے لئے اقبالؔ کی عالمانہ وسعتِ خیال اور حسرتؔ کی شخصیت کی ضرورت ہو گی۔ زیر بحث دور کے غزل گوؤں نے جو احساسِ مفکرانہ، جو سنجیدہ جذبۂ نشاط۔ جو مجہولیت سے خالی فلسفۂ زندگی۔ جو عمل سے لبریز تصوف۔ جو واقعیت و اصلیت جو نیا اندازِ بیان، جو معقول تحیر و تشکک، جو نئی امیدیں اور خوشیاں، جو نئی مجبوریاں اور پابندیاں، جو نیا سکون اور بیقراری غزل میں پیش کی ہے۔ اس کے بعد شاید قانونِ قدرت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ کچھ دیر غزل کا دور ملتوی ہو جائے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ غزل گوئی کے اعتبار سے رومانیت کا "نشاۃ الثانیہ" کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یہ دور عین مولانا حالی کی تحریکِ اصلاحِ غزل کے بعد شروع ہوا۔ جب طبائع کا رجحان نظم کی جانب ہو گیا تھا۔ اور

نادر کاکوروی وغیرہ اپنے خیالات مغربی سانچوں میں ڈھال رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظم کی طوالت ہی قبولِ عام کے منافی ہے اور غزل میں ایک ایک آدھ شعر کا دلی کیفیتوں کی ترجمانی کے قابل ہونا اس کی مقبولیت کے لئے سندِ دوام۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ غزل میں حسن وعشق کی باتیں ہوتی ہیں (یا بقول معترض اس کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہے) تو اس کے جواب میں کیا یہ سوال کرنے کی اجازت ہے کہ آپ نے توبہ کا اعلان کب سے کیا ہے؟

پانچواں باب

ڈرامہ۔ طنز، ہجو اور ظرافت

اردو میں ڈرامہ کی کل کائنات بیرونی تراجم ہیں۔ محمد عمر نور الٰہی صاحبان (مصنفین ناٹک ساگر) نے اس فن کی ترقی اور ترویج کے لئے بہت کوششیں کی ہیں اور بہت حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن ڈرامہ سٹیج کا محتاج ہوتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کو سٹیج میں بہت کامیابی نصیب ہوئی۔ جس سے فن ڈرامہ کی مقبولیت کے اسباب پیدا ہوتے رہے۔ مولوی عبد الماجد۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ ظفر علی خاں اور حکیم احمد شجاع صاحبان کے ڈرامے سٹیج پر چنداں کامیاب نہیں ہوئے۔ طرز جدید میں لکھنے والے اشتیاق حسین قریشی تاج فضل الرحمن

عبدالغفار بیشن ہیں۔ شاہد احمد۔ انصار ناصری۔ فضل حق قریشی جلیل قدوائی۔ سالک بٹالوی نے ترجموں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی ڈراموں کے ترجموں سے ذخیرۂ اردو کو مالامال کیا ہے۔

تاج صاحب کا ڈرامہ انار کلی اس دور کی بہترین ڈرامائی تصانیف میں سے ہے۔ یہ دراصل مغلیہ تمدن کی ایک کامیاب تصویر ہے موضوع کے انتخاب پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے لیکن سید صاحب نے اس میں محض "آرٹ" کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کے تاریخی پہلو کے مستند ہونے کو وہ قصہ کے لئے ضروری خیال نہیں کرتے۔

اشتیاق حسین صاحب قریشی صید زبوں میں عورت ذات کی مظلومی کا حال بیان کرتے ہیں۔ ترجموں میں گالزوردی۔ مولیئر۔ گوئٹے۔ میٹرلنک۔ اسکر وائلڈ۔ شلر۔ چیخوف کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ڈرامہ کا زندگی سے تعلق استوار نہیں ہوا۔ زندگی کی گہرائیوں سے آشنا ہونے کی کوئی کوشش عمل میں نہیں لائی گئی۔ اور مسائل ہند کی طرف التفات کا افسوسناک فقدان ہے۔

طنزیات و مضحکات میں اودھ پنچ کے بعد کچھ خلا سا پیدا ہو گیا تھا شاید اس لئے کہ ہندوستان میں سیاسی کشمکش ہے۔ اور دوسرے واقعات نے ہنسنے کی بجائے سوچنے پر قوم کو مجبور کر دیا تھا۔ تاہم انہی دنوں ملا رموزی نے سیاسی طنزیہ کا گلابی رنگ اختیار کیا (جس کو گلابی اردو کہا جاتا ہے) انہوں نے بے رنگ اردو میں بھی مزاحیہ مضامین لکھے۔ جو "صبح لطافت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "نکاتِ رموزی" بھی انہی کی کتاب ہے۔

سید احمد شاہ بخاری کے مضامین میں سنجیدہ نکتہ آفرینی ہے۔ جو رچی ہوئی ظرافت ہونے کی وجہ سے لطیف معلوم ہوتی ہے۔

رشید احمد صدیقی "طنزیات و مضحکات" کے مصنف ہیں۔ یہ اپنے رنگ میں طنز کے واحد استاد ہیں۔ اگرچہ اب حسرت کاشمیری (مصنف جدید جغرافیہ پنجاب) بھی ان کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن رشید صاحب کے مقابلے میں کم عمر ہیں۔

شوکت تھانوی کی کتاب "دنیائے تبسم" اور فرحت اللہ بیگ کے مضامین عظیم بیگ کی "روحِ ظرافت" اور تاج صاحب کی "چچا چھکن" ظرافت و مطایبہ کے اچھے نمونے ہیں۔

چھٹا باب

ناول اور افسانہ

اردو میں ناول مختلف قدرتی مراحل سے گزرتا ہوا سرشار اور شررؔ تک پہنچا۔ شررؔ جذبات کے زمانے کے ناول نگار تھے ان کا مقصد فن کی خدمت نہیں بلکہ تاریخی مناظر کا پیش کرنا اور ایک قوم کے شاندار ماضی کا نقشہ کھینچنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فن پسندوں کے نزدیک شررؔ کا کمال زبردست خامیوں سے خالی نہ تھا۔ بہرحال آپ نے ناول کے ارتقائی سفر میں فن کی بہت بڑی خدمت کی ہے شررؔ کے علاوہ حکیم محمد علی طبیب، رسواؔ، سجاد حسین۔ راشد الخیری

لہ ناول کے سلسلے میں وقار عظیم صاحب کی کتاب "ہمارے افسانے" سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے جس کا بصد شکریہ اعتراف کیا جاتا ہے

ظفر عمر۔ فیاض علی۔ مرزا سعید۔ قاری سرفراز حسین نے اس فن کو
چمکانے کی کوشش کی۔ لیکن اب اردو میں ناول نگاری قریب قریب
مفقود ہے اور توجہ زیادہ تر کہانیوں یا افسانوں کی جانب ہے۔
اس لیئے شرر کے بعد کے دور کو ہم افسانہ کی ترقی کا زمانہ کہ سکتے ہیں۔
مرزا ہادی رسوا ۱۹۳۱ء میں اردو کے اعلیٰ ناول نگار تھے۔
امراؤ جان ادا اور ذات شریف میں لکھنؤ کی معاشرت کا نقشہ کھینچا
گیا ہے۔ بہرام کی رہائی جاسوسی اور جرائم رسانی کا ناول ہے۔
ظفر عمر نے بھی جرائم اور جرائم رسانی کے ناول اچھے لکھے ہیں نیلی
چھتری۔ بہرام کی گرفتاری۔ چوروں کا کلب اور لال کھوپڑی آپ کے
عمدہ ناولوں میں سے ہیں۔
مرزا سعید نے دو قصوں خواب ہستی اور یاسمین میں جدید نوجوانوں
کی زود حس طبیعت کے راز کھولے ہیں۔
فیاض علی نے شمیم اور انور دو ناول لکھے جن میں معاشرتِ حاضرہ
کی مصوری کی ہے۔ اسی طرح قاری سرفراز حسین نے بازاری عورتوں
کی نفسیات اور ان کے گناہ میں پڑنے کے اسباب پر بہت غور و فکر
کیا ہے۔ شاہدِ رعنا اور ثروت دلہن کی بہت تعریف کی جاتی ہے
بعض جدید ناولوں میں بیگم مرزا احمد علی کا 'ماہ درخشاں' خاص ذکر

کے لائق ہے۔ اس میں مشرق و مغرب کی آویزش اور مذہب و مادیت کی کشمکش دکھائی گئی ہے اور ایک رنگ میں ایک معتدل راستہ تجویز کیا ہے۔

عربی۔ ترکی۔ بنگالی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بہت سے ناول ترجمہ کئے گئے۔

پریم چند اور سدرشن کا ذکر بھی ناول نگاروں میں آنا چاہیے تھا لیکن شاید ان کا صحیح مقام افسانہ کی دنیا ہے۔

پریم چند

بہرحال ناول اور افسانہ دونوں میں پریم چند[1] کا موضوع یکساں ہی ہے۔ اوّل جذبہ قومی جس میں راجپوتوں کی غیرت و حمیت کا جوش دکھایا گیا ہے (مثلاً وکرمادت رانی سارندھا۔ راجہ ہردول۔ گناہ کا اگن کنڈ۔ ان میں حقیقت شعاری ذرا کم ہے لیکن نہ اتنی کہ غیر فطری معلوم ہو۔ دوم مقامی رنگ ہے جس نے ان کے افسانوں اور ناولوں کو ہندوستان کے بہترین ادبی کارنامے بنا دیا ہے۔ وہ دیہاتی زندگی کی خوبیاں اور دقتیں۔ دلچسپیاں اور تلخیاں۔ دیہاتیوں کی سادگی اور اخلاص کا نقشہ اس حقیقی رنگ و روغن کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ کوئی آدمی متاثر ہوئے بغیر

---

[1] پریم چند کی ناول نگاری پر ملاحظہ ہو Scutinies گورنمنٹ کالج ، مجلس کے مضامین حصہ دوم

نہیں رہ سکتا۔ ناولوں میں بازار حسن۔ گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل ان کے عمدہ ترین ناول ہیں۔ نرملا اور راہِ نجات میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو وانشگاف بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے انجام عموماً طربیہ ہوتے ہیں جو ذرا غیر قدرتی سی بات ہے۔ کرداری ارتقا بھی خوب ہے۔ نمک کا داروغہ کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہے تفصیلات کا ذکر عموماً افسانے کے لئے عیب ہوتا ہے۔ اس کی بجائے تصور آفرینی سے مدد لی جایا کرتی ہے۔ لیکن پریم چند جزئیات و تفصیلات ہی کو حسن کا باعث بناتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے افسانوں میں رومان کی کمی ہے لیکن پریم چند جس ناگوار زندگی کا نقاش تھا۔ اس کے لئے رومان کا مفسر بننا قدرے دشوار تھا تاہم رومان کا کامل فقدان نہیں "پریم چند کے افسانے سرزمین ہندوستان کے بہترین افسانے ہیں"۔

سدرشن سدرشن" اردو کے سب سے بڑے جذبات نگار افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانے شاعر۔ اپنی طرف دیکھ کر، خانہ داری کا سبق۔ ترک ہنود۔ صدائے جگر خراش، افسانہ نویسی کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کا موضوع دولت و ثروت سے نفرت اور غریبی اور قناعت سے محبّت ہے۔ وہ اوسط درجہ کے ہندو شہریوں

کے مرقع نگار ہیں۔ ان کے نزدیک عورت انتہا پسند ہے۔ اعتدال اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

اس دور میں اگرچہ بعض عمدہ ناول بھی لکھے گئے لیکن درحقیقت اس کو افسانہ کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ شروع شروع میں افسانہ اصلاحی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ چنانچہ سلطان حیدر جوش نے مغربی طرز معاشرت کو رد کرنے کے لئے جو افسانے لکھے ان میں یہ مقصد بدرجہ اتم موجود ہے ان ابتدائی افسانہ نگاروں میں مقامی رنگ بالکل موجود نہ تھا۔ ان کے کرداروں میں بے آہنگی ہوتی تھی۔ اور ان کے افسانوں میں نفسیات کو چنداں اہمیت نہ تھی۔ لیکن مغرب کے اثر سے یہ کمی بتدریج دور ہو رہی تھی۔

یورپ میں علی الخصوص روس اور فرانس میں فن افسانہ کو جو عظمت عرصہ سے حاصل ہے۔ اس سے ہندوستانی افسانہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ بہت جلد ترکی۔ روسی۔ فرانسیسی۔ انگریزی بلکہ ایرانی اور جاپانی زبانوں سے ترجمے کیئے گئے۔ جن سے ہماری افسانہ نویسی کو بہت ترقی ہوئی۔ آرٹ اور فن کا وہ اعلیٰ تخیل جو اب تک نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ ہمارے سامنے آ گیا اور ہماری کردار نگاری کے اسلوب میں صد درجہ حسن پیدا ہو گیا۔ اس

کے علاوہ ترجموں نے "عورت" کو بہ حیثیت موضوع بہت رواج دیا
چنانچہ آجتک اس مضمون کو مختلف پہلوؤں سے آزمایا جا رہا ہے۔
پھر یہ بھی ہے کہ ترجمے سے ان ممالک کی روشن اور تاریک فطرتیں
ہم پر جلوہ گر ہو گئیں۔ ان فوائد کے ساتھ ساتھ بہت بڑا نقصان بھی
ہوا کہ ہماری جدت چھن گئی اور بقول وقار صاحب "سوچنے بیٹھے تو
چیخوف اور ابیج کی تخیلوں میں دماغ چکر کھانے لگے"۔ مزید براں
مقامی رنگ کا فقدان ہو گیا جس سے اصلی اثر ضائع ہو گیا۔

ترجمے میں اگرچہ میری کوریلی، فلابیر کی مادام باوری اور بٹلر
کی The way of all flesh کے تخیل نے بھی دماغوں کو
بہت متاثر کیا۔ لیکن مالیساں۔ ہارڈی۔ ترجنیف۔ چیخوف اور گورکی
کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ کچھ برس ہوئے جوائس کے شیطان ہلکا نشہ
دماغوں پر چڑھا ہوا تھا۔ اور Proust کی تلقینات سے لوگ مدہوش
ہو رہے ہیں۔ لیکن روسی ادب وقت کا سب سے بڑا موضوع ہے

جہاں تک موجودہ افسانہ میں مقامی رنگ کا تعلق ہے۔ میں ذکر
کر چکا ہوں کہ اب یورپ کے زیر اثر آہستہ آہستہ اس کی جانب توجہ
کی جا رہی ہے۔ پریم چند نے دیہاتی زندگی کے مناظر کو حقیقت کے

Contemporary movements in literature P.430

رنگ میں دکھا کر ہندوستان کی اصلی آبادیوں کے کوائف اور ان کی نفسیات سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ راجپوتی غیرت اور عصبیت کی مثالیں اکثر لوگوں کے سامنے ہیں لیکن پریم چند کے قومی مطمح نظر نے اس رنگ کو اور گہرا کر دیا ہے۔ سدرشن تہری ہندوؤں کے متوسط گھرانوں کا نقشہ کھینچتے ہیں جس طرح کہ فضل حق قریشی اور افسر تحریری متوسط مسلمان خاندانوں کے مرقع نگار ہیں۔ افسر میرٹھی ہندوستانیوں کے عام ذہنی رجحانات کی تصویریں بناتے ہیں اور رفراجیہ نگار اعظم کریوی سیاسی فضا میں پرواز کرتے ہیں۔

اسی طرح کردار نگاری اور نفسیات کے اعتبار سے بھی پریم چند، سدرشن، اعظم سجاد حیدر، نیاز، مجنون اور افسر نے وہ نئی راہیں نکالی ہیں جو اب تک اردو میں موجود نہ تھیں حال ہی میں بعض ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جن میں حقیقت نگاری اور فن کے اتباع پر انتہائی اصرار کیا گیا ہے۔ انگارے از احمد علی وغیرہ اور شعلے اسی صنف سے تعلق رکھتے ہیں جن میں بے نقاب حقیقت نگاری کا انداز اختیار کیا گیا ہے اگرچہ انگارے اور شعلے کا انداز کچھ ایک جیسا ہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو گرمی انگارے میں تھی وہ شعلے میں موجود نہیں شاید اسلئے کہ انگارے میں مصنفین نے جو بلند جست لگائی تھی۔ شعلے میں ان کی فطرت اس درجہ بلند نہ ہو سکی۔[1]

---

[1] چونکہ تمام افسانہ نویسوں پر قدرتی طور پر تبصرہ نہیں ہو سکتا اس لئے ایک مجمل سا حال حاشیہ میں دیا جاتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم ادب لطیف کے بانی ہیں: خیالستان، حکایات و احساسات، جلال الدین خوارزم شاہ۔ مجنون گورکھپوری

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

اگر ناول اور افسانہ کو کسی قوم کی زندگی کا آئینہ کہنا درست ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا افسانہ بلند مقصد اور معین نصب العین سے محروم ہے۔ شرر اور راشد الخیری حسن نظامی اور اس نوع کے ادھیڑ ادیبوں کے سامنے کم از کم یہ مقصد تو تھا کہ قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی بلند معیار زندگی کا قائم کریں۔ حسن نظامی نے دہلی کی گم گشتہ شوکت کے مٹے ہوئے نشانات پر نوحہ کیا۔ شرر نے صنادید عرب و عجم کے کارنامے بیان کئے۔ راشد الخیری نے جب دیکھا کہ نئے دور کے افق سے نئی زندگی کا آفتاب طلوع پذیر ہو رہا ہے تو قوم کی بیٹیوں کو جگایا کہ آخر ان کو قوم کی مائیں بننا پڑے گا۔

نوجوان نقادوں نے بڑے بوڑھوں کو تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان میں فن کی کمی ہے۔ ان کی کردار نگاری سست ہے۔ ان کا پلاٹ کمزور ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے سامنے ایک اصلاحی مقصد ہے

بقیہ صفحہ ۸۱:۔ ہیگل، شوپن ہار وغیرہ سے متاثر۔ دامن کوہ پوش بہترین مجموعہ۔

علی عباس حسینی۔ خزینہ منظر جیات ہے۔ رفیق تنہائی۔ بہو کی ہنسی، بوڑھا اور بارہ عمدہ افسانے۔ سلطان حیدر جوش۔ طنزیہ۔ مغربی تہذیب کے مخالف:۔ فسانۂ جوش وغیرہ۔

حجاب امتیاز علی۔ ان کے افسانے "میری ناتمام محبت" وغیرہ۔

جلیل قدوائی:۔ روسی افسانے:۔ سیر گل۔ اصنام خیالی

بعض نئے لوگ سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، حسن عباس اور ڈاکٹر رشید جہاں بھی قابل ذکر ہیں۔
عاشق بٹالوی:۔ سوز ناتمام

جو فن کے لیے موت ہے لیکن اس کے بعد آج تک جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں نہ فن ہے نہ مقصد۔ نہ تعمیر ہے نہ تخریب ——————
نہ جادہ ہے نہ منزل —————— بھٹکا ہوا کارواں ہے جو آرٹ کی بھول بھلیوں میں پھنس کر زندگی کی تلخ اور ناگزیر حقیقتوں پر غور کرنے سے غافل ہے۔ تاہم دنیا میں ہر کلیہ کی مستثنیات ہوتی ہیں اور اس کلیہ سے بھی پریم چند۔ سدرشن اور اعظم کریوی کی شخصیتیں مستثنیٰ ہیں۔ یا پھر ان نوعمر ادیبوں کی طرف ہم امید کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جو اب غریب اور کسان کے درد سے غمگین ہو کر مجبور ہو رہے ہیں۔

سب سے پہلے عورت کا مسئلہ لیجیے۔ اس صدی کے آغاز میں عورت درجہ بلند کرنے کی طرف ایک میلان پیدا ہوا۔ اس خیال کا اثر مذہب، شاعری اور ادب لطیف میں یکساں طور پر ملتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ آواز اصولی طور پر غلط نہ تھی۔ اسلیے جن حضرات نے اعتدال کے رنگ میں عورت کے درجے کو بلند کرنیکی کوشش کی۔ وہ ایک خدمت تھی لیکن بہت جلد بعض نازک اعصاب لوگ میدان میں آ گئے جو اگرچہ فرائڈ کے نظریات کے دلدادہ تھے لیکن فرائڈ کے اس خیال سے بے خبر معلوم ہوتے تھے کہ جو شخص جنسی میلانات کا زیادہ اظہار کرتا ہے وہ جنسی قوت سے محروم ہوتا ہے۔ بہر حال نیاز، مجنوں اور ان کے

ساتھیوں نے ایک زنانہ ادبِ لطیف کی بنیاد رکھی جس کی نسائیت مردانگی سے بیزار اور جس کی مردانگی نسائیت کے سامنے شرمندہ ہے۔

ابتدائی افسانوں میں عورت کو خوبیوں کا مجسمہ ظاہر کیا گیا جس کی معصومیت اور مظلومیت کی مفصّل کہانیاں پریم چند، راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش کے ہاں ملتی ہیں اس کے مقابلے میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عورت کو بدی کا مجسمہ قرار دیا دنیا میں گناہ کی طرف راغب کرنے والی قوت کو عورت کے مرادف ٹھہرایا، مثلاً عابد علی وغیرہ نے اس کو انسانی سیرت کے تاریک پہلوؤں کا محرک بتایا لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک تیسری رائے موجود تھی جس کی مغلوبیت اور انفعالیت بلکہ مفعولیت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکے گا۔ "محترم ترین مخلوق ہم پر حکمرانی کرنے والی"۔ "ایک لذّت ہے مجسّم ایک تسکین ہے مکمّل۔ ایک سحر ہے مرئی۔ ایک نور ہے مادّی"۔ "عورت کا حسن ان کے نزدیک صرف دیکھنے کے لئے ہے"۔ "آزاد رمیدہ آغوش سے دور"۔

نیاز اور مجنوں عورت کے عیوب میں بھی ایک حسن پاتے ہیں اور اس کو ایک عُریانی قرار دیکر فرماتے ہیں کہ "ہر صنعت کی تکمیل عریانی پر ہوتی ہے"۔ مجنوں کہتے ہیں محبت بلا ازدواج قائم رہ سکتی ہے اس میں مذہب وملّت کی تفریق بھی بے مقصد ہے مرد صرف عورت کو چاہتا ہے۔ اسی طرح "لیلےٰ کے خطوط" میں قاضی عبد الغفار نے تلخ مگر دلکش الفاظ میں مرد اور عورت دونوں کی یکبہ رخی تصویر پیش کی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں درد چبھن اور واقعیت بھی ہے لیکن حقیقت اور نفسیات کے اعتبار سے

بعض جگہ بہت متضاد نظر آتا ہے۔

یہ لوگ بھی کسی حد تک غنیمت تھے اب ہم ایک ایسے گروہ سے دوچار ہیں جس نے عورت کی خدائی کا اعلان کر رکھا ہے حالانکہ انہیں اس سے جو عقیدت ہے وہ ایک غرض سے ہے اور وہ بھی بہیمانہ ہے۔ عبادت اور عبودیت، خدا اور خدائی کا یہ تصوّر کتنا بھیانک کتنا دلدوز اور کتنا حیوانی ہے مثلاً ارشاد ہوتا ہے "دنیا میں ایسی حقیقتیں بھی ہیں جنہیں اخلاق نے ابتک گناہ سمجھا لیکن اب شاعری اور افسانہ نگاری برہنہ مصوّری کا نام ہے"[۱] انگارے کے بعض افسانوں میں یہ لغو نویسی اس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ "ہمارے افسانے" کے لائق مصنّف کو یہ کہہ دینا پڑا[۲] "کہ بعض افسانوں میں واقعات کا انتخاب ایسا کیا ہے جو بجائے خود گندے تھے یہ حقیقت کی بجد عریاں تصویریں تھیں ممکن تھا کہ لفظوں کا حسن پردہ پوش ہو سکتا لیکن لفظ ان سے بھی زیادہ بھدّے اور سوقیانہ تھے"۔

جرمنی اور فرانس میں جنگِ عظیم کے بعد عورت کے متعلق جو ردِّ عمل ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے زنانہ ادیب ابھی اس سے متاثر نہیں ہوئے Proust اور valery نے نیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور فرانسیسی یہ محسوس کرتے ہیں کہ فلابر مصنّف "مادام باوری" کا ہی تصوّر معاشرتی امور کے متعلق درست تھا[۳]۔ جرمنی میں Expressionist تحریک کے ادبا بھی گوئٹے کے تصوّر دلنشاں کے بارے میں اب وہ ہمدردی نہیں رکھتے[۴] شاید

۱؎ ہمارے افسانے از وقار عظیم صاحب ص ۸۲ ۲؎ ایضاً ص ۸۲۔ یہ بڑے ۳؎ "بادل نہیں آتے" کے متعلق ہے۔
۴؎ Contemporary movements in European literature (دیکھو الحاق)

ہمارے ادیبوں تک ابھی وہ ہوا ہی نہیں پہنچی اور ابھی اس سمندر کی لہریں ساحل سے نہیں ٹکرائیں ابھی تک وہ زندگی کی کشمکشوں اور میدانِ عمل کی صعوبتوں سے ناآشنا ہیں۔ وہ عیش کے خلوت کدوں کے دلدادہ اور نرم و نازک قالینوں کے عاشق ہیں۔ ان کو تو ایک سجا سجایا ڈرائنگ روم چاہیے۔ جہاں وہ عورت کے سہانے تصور کی پرستش کیا کریں۔ علامہ اقبال نے انہی عافیت کیشوں کے متعلق فرمایا تھا۔ ؎

ہند کا شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ——— آہ بیچارے کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

درحقیقت ہندوستانی ادب لطیف لامرکزیت اور لامقصدیت کا شکار رہا ہے ٹالسٹائے نے ایک دفعہ روسیوں کے متعلق کہا تھا "ان کی آرزوؤں میں قوت نہیں"۔ لیکن میں کہتا ہوں۔ ہندوستانی ادیبوں کی کوئی آرزو ہی نہیں۔ اس وقت ہندوستان جن معاشی اور مجلسی، سیاسی اور اقتصادی مصائب میں گرفتار ہے ان کے ازالہ اور حل کی تدبیر سوچنا ادیبوں کا فرض ہے۔ اب ہمیں ایم اسلم کی "گناہ کی راتیں" کی ضرورت نہیں بلکہ ان کروڑہا غریبوں کے افلاس، زندگی اور تعلیم کے مسائل کو سوچنا چاہیے جن کی ذہنی تربیت کا بار ہمارے سروں پر ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ترقی پسند مصنفین[1] نے اب عوام کا ادب پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ لیکن ان کو ایک نصیحت سن لینا چاہیے کہ جذبات کے جوش میں اعتدال کی باگ ڈور ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور ہر قدیم چیز کی شکست کا جنون دیوانگی اور سراسیمگی پر منتج نہ ہو۔ اشتراکی زندگی کے

---

[1] آرٹ کا ترقی پسند نظریہ از احمد علی صاحب ایم۔ اے در رسالہ اردو ۱۹۳۶ء ص ۳۶۷)

بعض پہلو لاکھ خوش آئند سہی لیکن ہم اس نصب العین سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتے۔ جو احمد علی صاحب نے بدیں الفاظ پیش کیا ہے۔ "ایک نیا فلسفۂ زندگی، ایک نیا ادب اور آرٹ پیدا ہو گیا ہے۔ مصنفوں اور فن کاروں نے درمیانہ طبقہ کے اوصاف اخلاق مثلاً حیا اور عصمت کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ اب ان میں کوئی جذباتی اثر باقی نہیں رہا اور گو کہ تعمیرِ قومی کے لیے تلخ حقیقت نگاری کرنا خوبی کی بات ہے۔ لیکن ہمارے ادیب اگر لغو نویسی، خرافات نویسی اور بے حیائی سے احتراز کریں تو مناسب۔

میں نے اجمالاً جنگِ عظیم کے بعد کے دور پر نظر ڈالی ہے۔ جس کے میلانات اور رجحانات کافی حد تک ادب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں یہ افسوس محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ دور ان عظیم الشان ہستیوں سے خالی رہا۔ جن سے انقلاب ظہور میں آیا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا باعث اس دور کے افکار میں تصادم اور تکملہ کی شدت کی کمی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ سیاسی ہیجان کے زیر اثر جرنلزم کی طرف عام میلان اس کا سبب ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس دور میں سر سیّد کے دور کے اعاظمِ رجال کی بہت خوفناک کمی محسوس ہوتی ہے۔ سر سیّد کے ساتھیوں کی منزل اگرچہ دور تھی اور مقابلہ سخت تھا لیکن ان کا ذہن صاف تھا لیکن ہمارے دور میں نصب العین ہی صاف نہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان میں افکارِ عالیہ کم نظر آتے ہیں جن کے بغیر بڑائی مفقود ہوتی ہے۔ عورت اور روٹی کا مسئلہ بہت بنیادی ہے۔ لیکن بموقفِ برٹرینڈ رسل کے قول کے مطابق

زندگی میں روحانیت کے بغیر ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور میں روحانیت کا
گلا گھٹ رہا ہے اور روحانی شورش اور بے اطمینانی کا کسی طریق پر علاج ممکن نہیں
اس کی وجہ یہ ہے کہ اب لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری دو ہی بنیادی ضرورتیں
ہیں۔ روٹی اور ہوسِ جنس۔ اس تخیل نے ان کو حیوانِ محض بنا دیا ہے۔ لٹریچر یا ادب
اس کو کسی اور طاقت کا یقین نہیں دلا سکتا۔ جو ان دونوں حیوانی ضرورتوں کے
علاوہ انسانی زندگی پہ اثر انداز ہے۔

موجودہ نسلوں نے سائنس کے زیرِ اثر مذہب کو ترک کر دیا ہے لیکن وہ
وقت بھی قریب ہے جب پھر سائنس کی ناکامیوں سے تنگ آ کر کسی اور روحانی نسخہ
شفا کی تلاش کرنے لگیں۔ اور اگر یہ معرفتی اور بقول احمد علی صاحب خیالی اور
بے بنیاد وعظ اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتا تو کم از کم ہمارے ادیبوں کو
ملک و ملت اور انسانیت کی خدمت کے سچے تصور کو تو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے

؎ بے وقت کا راگ ہے نہ سنیئے
واعظ کو مگر جھنجھوڑیے کیوں — اکبر

لہ Towards the 20th century by H.V. Routh
1937. P. 5346, 362, 370

لہ یہی خیال سر رادھا کرشنن نے اپنی کتاب یا مجموعۂ لیکچرز موسومہ بہ An idealist view of life (1932ء) میں ظاہر کیا ہے۔

مطبوعات اردو اکیڈمی لاہور

تدریس القرآن حصہ اوّل:- پارہ الٓمٓ کا ایک نئے انداز کا ترجمہ جو بیک وقت بامحاورہ بھی ہے۔ اور تحت اللفظ بھی۔ لغاتِ قرآن، اور ضروری گرامر بھی ساتھ ساتھ موجود ہے پیش لفظ از [illegible] نظامی (قیمت ۱ر)

غالب:- (انگریزی) دہلی کے مشہور فلسفی [illegible] شاعر کی خدمت میں ایک مشرقی نوجوان [illegible] کی طرف سے ہدیہ عقیدت جس میں غالب کی مفصل سوانح کے علاوہ دیوانِ غالب (اُردو) کے قریباً تیسرے حصے کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ از عبداللہ انور بیگ قیمت مجلد عہ